www.urducouncil.nic.in

جنوری 2018 قیمت:- /10₹

ماهنامه

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کی کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

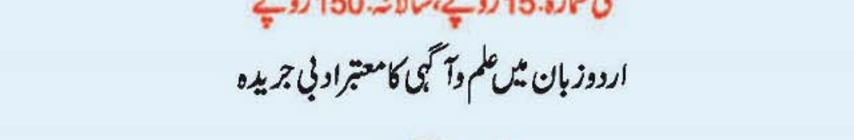

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 6 شمارہ: 01 جنوری 2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل ۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی -110025
فون: 49539000
شعبہ ادارت: 11-49539009

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آر
بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی -110066
فون: 26109746
ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد -500002
فون: 040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
	یوم جمہوریہ		
	یوم جمہوریہ اور اس کا پیغام	سید واجد علی شاہ	06
	26 جنوری	ناصر الدین ناصر	08
	چھبیس جنوری	عائشہ رضوان	09
مضامین	نیا کلینڈر اور دوسری کہانیاں	قاضی مشتاق احمد	10
	خون : ایک تعارف	عظیم اقبال	13
	میں میں : بکری	شمیم احمد صدیقی	16
نظمیں	بیٹی کی حفاظت	محمد عمران احمد شجر گلے گاوی	19
	ہاں ایک بیٹی ضرور ہونی چاہیے…	معلم شیخ صابر	20
کہانیاں	ہرے رنگ کا جادو	کرشن چندر	21
	داستان ضحاک	آصف نعیم صدیقی	26
	لالچ	شاد عباسی	30
	سچا دوست	شمس الدین شمس	33
نظمیں	تتلی	ارشد جمال حشمی	34
	آ گئی سردی	ظہیر حسن ظہیر	35
کہانی	چالاک عقاب	رونق جمال	36
نظم	واہ واہ لڑکیاں	حیدر بیابانی	38
باتصویر کہانی	کھانے کی کھیر	ذکیہ مشہدی	39
قسط وار ناول	زمین کی تہہ میں	شکیل صدیقی	43
کہکشاں	مجاہد آزادی حاجی بیگم	رابعہ خاتون علوی	52
	اچھی باتیں	سمیہ خانم نور خان	54
	مزاحیہ پیغام	سیدہ مظہر سلطانہ	54
	آؤ اردو سیکھیں		55
ننھے فنکار	صبح کا بھولا	سحر اسعد	57
	بچوں کی پینٹنگ		60

آپس کی باتیں

دوستو! نیا سال مبارک ہو۔ ہر نیا سال ہمارے لیے نئے خواب اور نئی خوشیاں لے کر آتا ہے۔ اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان نئے خوابوں کی تعبیر کیسے تلاش کریں۔ نئے سال میں نئے عزم اور ارادے کے ساتھ ہمیں وہ کام کرنا ہے جس سے ملک کا نام روشن ہو۔ ملک کی ترقی ہو، ملک میں خوش حالی آئے کیونکہ ملک کی ترقی ہی میں ہم سب کی ترقی چھپی ہوئی ہے۔

دوستو! سال کا پہلا مہینہ جنوری ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وہ مہینہ ہے جس میں ہم 26 تاریخ کو یومِ جمہوریہ مناتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے جشن کا دن ہوتا ہے۔ آپ سب کو پتہ ہوگا کہ جمہوریت ہمارے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی جمہوریت کی وجہ سے ہمیں سارے حقوق میسر ہیں۔ جمہوریت نہ ہو تو ملک میں افراتفری پھیل جائے گی اور ملک کا نظام بگڑ جائے گا۔ ہمیں اس جمہوریت کی جڑوں کو اور مضبوط کرنا ہے۔ ہمیں سارے مذہبی، نسلی تعصب سے آزاد ہو کر اپنے ملک کی بہتری کے بارے میں سوچنا ہے۔ تبھی ہم اپنے ملک کے اچھے اور سچے شہری بن سکتے ہیں۔

26 جنوری کے علاوہ اس مہینے میں اور بھی بہت سے خاص دن منائے جاتے ہیں ان میں پرواسی بھارتیہ دیوس (9 جنوری)، قومی یووا دیوس (12 جنوری)، ہندوستانی فوج کا دن (15 جنوری)، قومی بالیکا دیوس (24 جنوری)، ووٹروں کا قومی دن (25 جنوری) کا ذکر کر سکتے ہیں۔

پرواسی بھارتیہ دیوس 9 جنوری کو منایا جاتا ہے کیونکہ اسی تاریخ کو مہاتما گاندھی افریقہ سے ہندوستان واپس آئے تھے۔ 2003 سے یہ دن منانے کی شروعات ہوئی تھی۔ اِس کا مقصد غیر ممالک میں بسے ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی تہذیب وتمدن سے واقف کرانا ہے۔ اِس دن پوری دنیا میں بسے ہندوستانی اپنے وطن آتے ہیں اور اپنے ملکی وغیر ملکی دوستوں سے ملتے ہیں۔ اپنے جذبات اور مسائل سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے ہیں۔ مرحوم لکشمی مل سنگھوی نے اس دن کو قومی سطح پر منانے کی سفارش کی تھی۔ مذہبی پیشوا اور فلسفی سوامی ویویکانند کے یومِ پیدائش 12 جنوری کو جوانوں کے قومی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس کی شروعات 1985 سے ہوئی۔ اس دن اسکولوں اور کالجوں میں مختلف پروگراموں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی سوامی ویویکانند کی تعلیمات اور پیغام سے جوانوں کو واقف کرایا جاتا ہے۔ 15 جنوری کو ہندوستانی فوج کے قومی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اسی دن 1949 کو لیفٹیننٹ جنرل کے ایم کری اپا نے 1949 میں ہندوستانی فوج کے کمانڈر ان چیف کا عہدہ سنبھالا تھا۔ اس دن ہندوستانی فوج کی حصولیابیوں اور قربانیوں کو یاد کیا جاتا ہے اور ہندوستانی فوج کے دفاتر میں مختلف پروگراموں کا انعقاد بھی ہوتا ہے۔ ووٹرس (رائے دہندگان) میں بیداری پیدا کرنے کے مقصد سے 25 جنوری کو قومی ووٹرس ڈے کے طور پر منایا جاتا ہے۔ الیکشن کمیشن کا قیام 1950 میں ہوا تھا۔ 25 جنوری 2011 کو اس کے قیام کے 61ویں برس سے اس دن کے منانے کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت کی صدر جمہوریہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل نے اس کی شروعات کی تھی۔ اِس دن نئے ووٹروں کا نام رائے دہندگان کی فہرست میں جوڑا جاتا ہے۔ ساتھ ہی انتخاب سے جڑی دیگر جانکاریاں بھی دی جاتی ہیں۔

24 جنوری کو قومی بالیکا دیوس منایا جاتا ہے۔ اِس دن لڑکیوں میں تعلیم کے تئیں بیداری پیدا کرنے، انھیں خود مختار بنانے اور ان کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے مختلف پروگراموں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ 2008 میں یہ دن منانے کی شروعات ہوئی تھی۔ 26 جنوری کو ہمارے ملک میں یومِ جمہوریہ کے طور پر منایا جاتا ہے اور یہی دن آسٹریلیا کے لیے بھی کافی اہمیت رکھتا ہے اور وہاں 26 جنوری کو قومی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ 26 جنوری 1788 کو برطانیہ کا پہلا جہاز سڈنی پہنچا تھا اور اس جگہ کو نیو ہالینڈ کا نام دیا۔ اس جہاز کے کپتان آرتھر فلپ نے برطانیہ کا قومی جھنڈا لہرا کر اسے برطانوی بستی کے طور پر اعلان کر دیا۔ تبھی سے اسے قومی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔

'بچوں کی دنیا' کے تازہ شمارے میں آپ کے لیے مختلف طرح کی تحریریں ہیں۔ ان تحریروں سے آپ کے ذہن کو نئی روشنی ملے گی۔ اچھی اچھی کہانیاں ہیں اور پیاری پیاری نظمیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کو پہلے کی طرح نئے سال کا یہ شمارہ بھی پسند آئے گا۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

اس وقت ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میرے ہاتھوں میں ہے۔ ستمبر کے شمارے میں یومِ اساتذہ کے کالم میں میری نظم استاد کو جگہ دے کر مجھے شاد کردیا۔ میری خوشی کی انتہا نہیں ہے اور میرے بچے بھی کافی خوش ہیں۔

محمود اختر، محلّہ قاضی پورہ، جلال پور، ضلع امبیڈکر نگر، یوپی

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ہمیں بہت پسند ہے۔ اس رسالے کے ذریعے اپنے خیالات لکھ کر آپ تک بھیج سکتے ہیں۔ ہمارے مدرسے کے تمام بچے بھی بچوں کی دنیا کو بہت پسند کرتے ہیں۔

خیر النساء مکاندار، سرکاری اردو مدرسہ نمبر 2، بیل ہونگل

اکتوبر 2017 کا شمارہ 'بچوں کی دنیا' موصول ہوا۔ سب باتیں کہنے سے پہلے ایک بات کہہ دوں۔ دوسرے پرچوں میں شائع شدہ تخلیقات کو سراہا جاتا ہے۔ آپ کو مدیرانہ ذمے داریوں میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں کہ بیک وقت ہر شمارے کے ہر اداریے کے کئی مداح ہیں۔ مجھے کہنے دیجیے۔ اداریہ میں شائع شدہ یہ الفاظ انسانیت کی معراج کا انکشاف کرتے ہیں کہ ”ان سب کی نجات پانے کے لیے حکومت اپنی سطح پر کوششیں کررہی ہیں۔ اپنے گھر کے بچے ہوئے کھانے، روپے، پرانے کپڑوں سے ہم غریب بچوں کی مدد کرسکتے ہیں۔“

مہاتما گاندھی سے متعلق اس سے زیادہ اور اس سے اچھا کیا کہوں میرے پاس ان کی خودنوشت سوانح حیات کا اردو ترجمہ 'تلاشِ حق' موجود ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مترجم ”ڈاکٹر عابد حسین (ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی) نے بہترین اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ تصنیف نوجیون پرکاشن مندر، احمد آباد سے شائع شدہ ہے۔ اس شمارے میں مہاتما گاندھی پر نثری و شعری مواد کے عمدہ نمونے ہیں۔

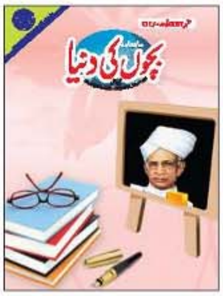

مہاتما گاندھی کے علاوہ بچوں کی دنیا اکتوبر 2017 سے میں نے جن موضوعات کی خواندگی کی ہے، ان میں سے ہندوستان کے صدرِ جمہوریہ، ہمت کی ہمالے، ام الخیر، خوب پسند آئے۔ مہدی پرتاپ گڑھی کی نظم 'کھالے کبوتر دانہ' ضیاء الرحمٰن جعفری کی نظم 'شیر کی باتیں سن کر' معراج احمد کی نظم 'چیونٹی'، چھوٹے چھوٹے عنوانات پر اچھی اچھی، پیاری پیاری، دلچسپ نظمیں ہیں۔

کچھ بچوں کے Drawing & Painting کے نمونے بھی ان کی اطمینان بخش کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اشفاق کارنجوی، جی این اردو ہائی اسکول، واڈے گاؤں، اکولہ، مہاراشٹر

معذرت

دسمبر 2017 کے شمارے میں صفحہ 35 پر شاد فاطمہ بنت ناصر خاں کے نام سے ایک نظم 'کیسے سمجھاؤں نانی کو' شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم معروف شاعر جناب 'مظفر حنفی' کی ہے۔ ہمیں یہ نظم بذریعہ ڈاک شاد فاطمہ کے نام سے موصول ہوئی تھی اس لیے ان کے نام سے ہی شائع ہوگئی۔ آپ سب سے درخواست ہے کہ ننھے فنکار یا کہکشاں جیسے کالموں میں اگر دوسرے شاعر، ادیب کی تحریریں بھیجیں تو اس شاعر یا ادیب کا حوالہ ضرور دیں۔ کسی اور کی تحریر اپنے نام سے بھیجنا مناسب نہیں۔ (ادارہ)

سید واجد علی شاہ

یومِ جمہوریہ اور اس کا پیغام

ہمارا وطن عزیز ملک ہندوستان آج دنیا کا عظیم جمہوری ملک ہے۔اس جمہوریت کو حاصل کرنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے اپنی جان و مال کی قربانی دی۔ ایک طویل لڑائی کے بعد انگریزوں سے نجات ملی اور 15 اگست 1947 کو ہمارا ملک آزاد ہوا۔لیکن اِس آزادی کے بعد بھی ہمارا اپنا آئین نہیں تھا۔ملک کا دستور مرتب کرنے سے قبل دنیا میں رائج تمام نظام ہائے حکومت کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس ملک کا دستور جمہوری بنیادوں پر تیار کیا جائے گا،جس میں ملک کے ہر طبقے کے لوگوں کو مکمل آزادی اور آئین کے حقوق وتحفظ حاصل ہوں گے۔ آئین بنانے کا سلسلہ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی لیڈرشپ میں چلا اور آخرکار یہ آئین 1950 میں مکمل ہوگیا اور اسے 26 جنوری 1950 کو نافذ کردیا گیا۔اِس طرح ہمارا ملک ایک جمہوری ملک بن گیا۔ایسا جمہوری ملک جس کی مثال دنیا کے دیگر ملک دیتے ہیں۔ اس دن کو ہم تمام ہندوستانی یوم جمہوریہ کے نام سے مناتے ہیں جو اس ملک میں اکثریت اور اقلیت کے لیے بہت بڑی نعمت ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کا سیکولر دستور ہندوستان کی حفاظت اور اس کے اتحاد کی ضمانت دیتا ہے تو درست ہوگا۔

26 جنوری اسی یاد کو تازہ کرنے کا دن ہے۔اسے قومی تہوار کا درجہ عطا کیا گیا ہے۔اس موقعے پر ہم بلا لحاظ مذہب، نسل، ذات رنگ سب ہی سرکاری غیرسرکاری اداروں میں قومی پرچم لہراتے ہیں اور اپنے شہیدوں کی یاد مناتے ہیں، جن

کے دم سے آج اِس جمہوری ملک میں امن و چین کی سانس لے رہے ہیں۔ جمہوریت زندگی کا ایسا دستور اور تعمیر و ترقی کا ذریعہ ہے جس سے صحیح طور پر زندگی کی نشو و نما ہوتی ہے۔ جمہوری نظام ایسا ماحول پیدا کرتا ہے جس میں انسان کو پھلنے پھولنے اور زندگی کے ہر میدان میں ترقی کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ جمہوریت کی بنیادیں تو عدل و انصاف پر ہی قائم ہوتی ہیں۔ جمہوریت میں حکومت عوامی ہوتی ہے، پنچایت سے لے کر اسمبلی اور پارلیمنٹ تک نمائندے کا چناؤ عوام کرتے ہیں۔ جمہوری ملک میں بسنے والے ہر فرد کو مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ مندروں میں گھنٹوں کی آواز ہوگی تو مسجد کے میناروں سے اذان کی آواز آئے گی۔ چرچ میں عبادت کی آزادی ہوگی، گردواروں میں گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہوگا۔ کوئی کسی کے مذہب پر انگلی نہیں اٹھائے گا۔ تمام شہریوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ جمہوریت کا یہ پیغام تو یقیناً ہر شخص کو جینے کا حق دیتا ہے۔ چاہے اونچی عمارت میں رہنے والا ایک کروڑ پتی ہو یا ایک جھونپڑی میں رہنے والا نابینا محتاج شخص۔ چاہے کار کی سواری کرنے والا ایک امیر زادہ ہو یا پیدل چل کر اسکول جانے والا غریب کی آنکھوں کا تارا، چاہے وہ بورے پر بیٹھ کر قاعدہ بغدادی پڑھانے والا ایک بزرگ ہو یا یونیورسٹی میں کرسی پر بیٹھ کر لیکچر دینے والا ایک پروفیسر، جمہوریت کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ آزادی اور برابری جمہوری نظام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ جمہوریت کی تعمیر چار اصولوں پر قائم ہے:

(1) انصاف (2) مساوات (3) آزادی (4) برادرانہ برتاؤ۔ مکمل آزادی انسان کے لیے وہ نعمت ہے جس میں انسانیت کا بیج پنپتا ہے۔ خود بخود علم و محبت، محنت اور خوش اخلاقی جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ آزاد خیالی اور برادرانہ برتاؤ سے اخلاقی قوت کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس طرح جمہوری نظام مستحکم بنتا ہے۔

ہمارا آئین صاف ستھرا ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ آئین میں کسی کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے ممالک بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جہاں جمہوریت کے ذریعہ ہندوستانیوں کو بہت سے اختیارات دیے گئے ہیں وہیں دوسری طرف ان کو بہت سارے فرائض بھی انجام دینے پڑتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے حقوق کو پورا کرنے اور اپنے آرام و آسائش کے لیے وہ دوسروں کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ ایمانداری کے ساتھ اپنی بہتری اور ترقی کی فکر میں رہنے کے ساتھ دوسروں کی بھلائی کا خیال رکھے۔ اپنے وطن سے سچی محبت رکھے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے ملک و قوم کا نام نیچا ہو اور جمہوری نظام کمزور ہو۔ ہر شخص اپنے دل سے نفرت، حسد اور کینہ، کو دور کرنے کی کوششیں کرے۔ رواداری اور محبت ہی انسانیت ہے اور اگر یہ اوصاف مضبوط ہوں تو جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ ہندوستان کے آئین کو ماننے میں ہی ملک کی بھلائی ہے۔ ہمیں اپنے ملک کے ذرّے ذرّے سے محبت ہونی چاہیے۔ آیئے ہم یومِ جمہوریہ کے موقعے پر یہ عہد کریں کہ ہم اپنی قوم و ملک کے لیے جہاں تک ممکن ہوگا اپنے کو تیار رکھیں گے اور اِس کے دامن کو کسی بھی داغ سے محفوظ رکھنے کے لیے دل و جان سے کوششیں کریں گے۔

■

Syed Wajid Ali Shah
35, Sewa Sadan Block Complex
12 First Floor, Lane No.:1, Mandawali
Fazil Pur, Delhi - 110092

ناصرالدین ناصر

26 جنوری

چھبیس جنوری وہ سوغات لے کے آئی
قومی ترانہ سب کا رنگوں کے ساتھ لائی
دستور یہ ہمارا انمول پیارا پیارا
پیارا ہے اس کا پرچم بھارت وطن ہمارا
چھبیس جنوری جو آئی اڑان بھر کر
دستور کو ہمارے ترکش میں لائی تن کر
یومِ جمہوریہ پر لہراتے خوب پرچم
ہندو ہو یا کہ مسلم بھارت کے دل کی دھڑکن
دنیا میں سرخرو ہو بھارت کا پیارا پرچم
تن من اور دھن سے گاتے چلو یہ سرگم
من کو جو بھا گئی ہے خوشیوں میں نہا گئی ہے
چھبیس جنوری کی سوغات چھا گئی ہے
ہر بھارتی رتن ہے محنت ہمارا دھن ہے
گنگ و جمن ہماری تہذیب کا چمن ہے
باپو کی سوچ دیکھو قوموں میں لوچ دیکھو
دیکھو عروج دیکھو پیارا وطن یہی ہے
ٹیپو کی شان دیکھو ہاتھوں میں جان دیکھو
کٹ کے گری ہیں کڑیاں نایاب یہ رتن ہے

■

Dr. Nasiruddin Nasir
Urdu Girls High School
wa Junior College of Science
Malkapur, Distt, Buldana (MS)

عائشہ رضوان

چھبیس جنوری

جشن جمہوریت کا منائیں گے ہم
قربانی مجاہدوں کی دہرائیں گے ہم
جمہوری دستور و آئین پر چل کر بچو
آگ نفرت و دشمنی کی بجھائیں گے ہم
کیا ہے جمہوریت، معلوم ہے ہم کو
گاندھی، نہرو آزاد، سب محبوب ہیں ہم کو
ہندو مسلم، جینی بدھ، سکھ اور عیسائی
رہتے تھے آپس میں سب مل کر جیسے بھائی بھائی
رنگ لائی امبیڈکر اور راجندر پرشاد کی محنت
کیا ہندو اور کیا مسلم، ختم ہوئی، تقسیم کی لعنت
سیکولر ہے یہ ملک ہمارا، جمہوریت ہے اس کی پہچان
تہذیب گنگ و جمن، ہے اس ملکی نرالی شان
مسجد مندر قطب مینار، لال قلعہ اور تاج محل
اجنتا الورا اور کھجوراہو بھی ہیں ضرب المثل
آج پھر بچو! یہ عزم ہمیں دہرانا ہے
سرحد پر اپنے وطن کی گردن کو کٹوانا ہے
خون ہم اپنے شہیدوں کا بھلا سکتے نہیں
وطن کی یادگاروں کو یوں مٹا سکتے نہیں
ہر سال یوں ہی آتا رہے چھبیس جنوری
درس اخوت ومحبت کا یوں ہی دیتا رہے چھبیس جنوری

Ayesha Rizwan C/o Abdul Qadir
Mohalla Lakshmi Sagar
Near Kotwali Chowk Bhauwarah
Madhubani - 847211 (Bihar)

قاضی مشتاق احمد

نیا کلینڈر اور دوسری کہانیاں

بارہ مہینوں کی کہانی

''ڈیڈی! کیا یہ دنیا بنی تب سے یہ کلینڈر ہے؟'' منے میاں نے پوچھا۔

''نہیں بیٹے! پہلے گھڑی بنی پھر کلینڈر بنا۔''

''ذرا تفصیل سے بتایئے—''

''تم نے وہ سٹی گارڈن میں رکھی ہوئی دھوپ کی گھڑیاں دیکھی ہیں نا؟ پہلے اسی طرح وقت گنا جاتا تھا۔ پھر گھنٹے بنے۔ پھر دن۔ پھر مہینے اور پھر سال۔ تمھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ پہلے سال کے 304 دن تھے اور صرف دس مہینے۔ سال کا پہلا مہینہ مارچ سے شروع ہوتا تھا۔ رومن بادشاہ 'نیوماپامپلس' نے سال میں دو مہینوں کا اضافہ کیا۔ جنوری کو گیارہواں مہینہ اور فروری کو بارہواں مہینہ بنایا۔ اس سے پہلے فروری کے تیس دن تھے جولیس سیزرس نے ایک دن کم کرکے پانچویں مہینے میں ایک دن کا اضافہ کیا اور اسے اپنا نام دیا 'جولائی' (پہلے یہ پانچواں مہینہ تھا)

''کیا ہر مہینے کے نام کی کوئی وجہ ہے؟''

''جی ہاں ضرور ہے۔''

''تو آپ بارہ مہینوں کی کہانی سنایئے۔''

''دیکھو! غور سے سننا اور بیچ میں بولنا نہیں—''

''ہم بالکل چپ رہے ہیں—''

''شاباش! کہا جاتا ہے کہ 'جنوری' یہ نام قدیم رومن دیوتا 'جینس' Jenus کے نام پر رکھا گیا ہے اس دیوتا کے دو منھ تھے ایک ماضی (گزرا ہوا زمانہ) کی طرف اور دوسرا مستقبل (آنے والا زمانہ) کی طرف تھا۔

'فروری' یہ نام پرانے لیٹین لفظ 'فیبر واسس' سے لیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے 'پاک کرنا' کہا جاتا ہے کہ جب مارچ پہلا مہینہ تھا (پرانے دس مہینوں کے سال میں) اور فروری آخری مہینہ۔ تب رومن لوگ پاک صاف ہونے کا جشن مناتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نئے سال (اس زمانہ میں مارچ مہینہ سے نئے سال کی شروعات ہوتی تھی) کا استقبال 'پاک وصاف' ہوکر کرنا چاہیے۔

'مارچ' مہینے کا نام 'مارس' دیوتا کے نام سے رکھا گیا ہے۔ یہ جنگ کا دیوتا ہے اور ساتھ ہی زراعت کا دیوتا۔ یہ بہت غصیلا سمجھا جاتا ہے۔ اس کی داڑھی بہت لمبی ہے۔ ہاتھ میں بھالا اور ڈھال تھامے یہ کھڑا رہتا ہے۔ اس زمانے میں روم کے کسان اس کی پوجا کرنے کے بعد ہی کھیتی کا کام شروع کرتے تھے۔

وہاں مارچ سے برسات کا موسم شروع ہوتا تھا۔

'اپریل' یہ نام لیٹین زبان کے لفظ 'اپرائر' سے لیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے 'آغاز کرنا' رومن لوگ یکم اپریل کو 'آل فولزڈے' (بے وقوفوں کا دن) مناتے تھے۔ دنیا کے ہر ملک میں آج بھی اپریل فول بنانے کا رواج قائم ہے۔

'مئی' یہ مہینہ رومن دیوی 'منے یا' کے نام سے منسوب ہے۔ یہ دیوتا 'الٹاس' کی بیٹی ہے جس نے اپنے کندھوں پر زمین اٹھا رکھی ہے۔

'جون' یہ نام جوپیٹر دیوتا کیرانی 'جونو' کے نام سے رکھا گیا ہے جو جنت کی رانی مانی جاتی ہے اور اس کا رتھ خوبصورت مور چلاتے ہیں۔

'جولائی' جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے 'جولیس سیزرز' کے نام سے منسوب ہے۔

'اگست' روم کے بہادر راجہ 'آگسٹس' کے نام سے منسوب ہے۔ پہلے جب یہ چھٹا مہینہ تھا اس کا نام تھا 'ساکٹلس' دو مہینوں کے اضافے کے بعد یہ آٹھواں مہینہ بنا اس لیے نام میں تبدیلی ہوئی۔

'ستمبر' کا مطلب ہے 'ساتواں' اور 'اکتوبر' کا مطلب ہے 'آٹھواں'۔ سال میں دو مہینوں کے اضافے کے باوجود ان کے نام پرانے ہی قائم رہے۔ کسی نے ان کے نام تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ 'نومبر' اور 'دسمبر' کا بھی یہی حال ہے۔ ان کا مطلب بھی نواں اور دسواں ہی ہیں جو اب تک دنیا میں قائم ہیں۔"

"ڈیڈی! ایک آئیڈیا ہے—" منے میاں کچھ سوچ کر بولے کہ "ستمبر سے دسمبر تک مہینے خالی ہیں۔ ہم ایسا نہیں کرسکتے کہ ستمبر کو دادی اماں کا نام، اکتوبر کو آپ کا، نومبر کو ممی کا اور دسمبر کو میرا نام۔"

"نہیں بیٹے! یہ ممکن نہیں۔ 1852 میں 'گریگری' نے صحیح کلینڈر بنایا جو آج تک استعمال ہوتا ہے اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔

"تب میں نیا کلینڈر بناؤں گا۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔" ڈیڈی بولے "جب تک تم منے میاں سے منور حسین خاں بن جاؤ گے اور اس کلینڈر کا نام ہوگا منور کلینڈر—"

منے میاں خوشی سے اچھلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بھاگے شاید نیا کلینڈر بنانے کا کام انھوں نے ابھی سے شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے "جو کل کرنا ہے وہ آج کر اور جو آج کرنا ہے وہ ابھی—" دنیا میں سب سے قیمتی شے وقت ہے اور وقت گزر جانے کے بعد واپس نہیں آتا۔

نیا کلینڈر

منے میاں کے دماغ میں یہ بات گھر کرگئی تھی کہ انھیں نیا کلینڈر بنانا ہے۔ ڈیڈی نے اُن سے کہا تھا کہ پہلے اپنا ٹائم ٹیبل بناؤ۔ دو گھنٹے محنت کے بعد منے میاں نے اپنا کلینڈر بنالیا۔

صبح 6 بجے— نیند سے بیدار ہونا۔

6 سے 6½ بجے تک— ضروریات سے فارغ ہونا۔

6½ سے 7½— انگریزی کی پڑھائی

7½ سے 8½— حساب

8½ سے 9½— دیگر مضامین

9½ اسکول کے لیے روانگی

10 سے 5 اسکول

5½— گھر واپسی

5½ سے 6½ — آرام

6½ سے 7½ — سائنس کی پڑھائی

7½ سے 8 — تاریخ کی پڑھائی

8 بجے — رات کا کھانا

8 سے 9 بجے — اردو اور ہندی زبان کی پڑھائی۔

10 بجے — سو جانا

''کیوں ڈیڈی! کیسا ٹائم ٹیبل بنایا؟''

''اس میں عبادت، ورزش، کھیل کود اور تفریح کے لیے کوئی وقت نہیں؟'' ڈیڈی نے پوچھا۔

''کھیل کود اور تفریح؟''

''ہاں بیٹے! یہ بہت ضروری ہے اور ہاں ساتھ ساتھ عبادت بھی۔ ہر مذہب انسان کو سیدھی راہ پر چلنے کی تعلیم دیتا ہے۔ انسان اسی لیے پیدا ہوا ہے کہ وہ دنیا میں اچھے کام کرے، دوسروں کی مدد کرے، ہر ایک کے کام آئے۔ برائیوں سے دور رہے اس لیے صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی اپنے اپنے طریقے سے عبادت کرنا چاہیے۔ پھر ورزش، سب سے اچھی ورزش ہے کھلی ہوا میں چہل قدمی کرنا، صبح سویرے کی تازہ ہوا میں وہ تازگی ہوتی ہے کہ انسان تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ ہرے بھرے باغات اور لان دیکھنے سے نظر تیز ہوتی ہے۔ اس کے بعد نہانا ضروری ہے۔ ہمارے بدن میں باریک مسامات ہوتے ہیں جن کے ذریعے پسینہ خارج ہوتا ہے۔ اگر ہم نہانا بند کر دیں تو وہ مسامات بند ہو جائیں گے اور جلد پر میل جم جائے گا اس سے کئی بیماریاں ہو سکتی ہیں۔ نہانے سے پہلے آنکھ، ناک، منھ اور دانتوں کی صفائی ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں نا ''تن پاک تو من پاک۔''

کھانا کھانے کے لیے بھی وقت مقرر کر لینا ضروری ہے۔ جب خوب بھوک لگے تب کھائیں اور تھوڑی بھوک باقی رہے تو کھانا چھوڑ دیں۔ کھانے میں سبز ترکاریاں، ساگ پات، دالیں دہی، چھاچھ کا استعمال ضروری ہے۔ گوشت، مچھلی، انڈے، عمدہ غذا ہیں لیکن صرف گوشت، انڈے ہی زیادہ عرصے تک کھانا صحت کے لیے مناسب نہیں۔ ان کے ساتھ سبزی، دالیں بھی ضروری ہیں۔

دن بھر کی محنت مشقت کے بعد تھوڑی سی تفریح ضروری ہے۔ کبھی ٹی، وی دیکھیے۔ ناٹک، سنیما دیکھ آئیے لیکن ''کام کے وقت کام اور تفریح کے وقت تفریح۔''

اور پھر رات میں آرام کے لیے نیند ضروری ہے۔ تھکن دور کرنے کا یہ قدرتی طریقہ ہے۔ آرام وہ نیند کے بعد انسان چست و چالاک ہو جاتا ہے اور نئے سرے سے کام کرنے کے قابل ہوتا ہے—''

''تب تو میرا سارا ٹائم ٹیبل غلط ہو گیا۔''

''بالکل۔ صرف کھانا پینا، پڑھنا اور سو جانا زندگی نہیں—''

''بات سمجھ میں آ گئی— میں دوبارہ ٹائم ٹیبل بناؤں گا اور جب ٹائم ٹیبل بن جائے گا تب نیا کلینڈر بنانے کا کام شروع کر دوں گا—''

''میری نیک خواہشات تمھارے ساتھ ہیں۔ زندگی میں کوئی نیا کام کر کے اپنے خاندان کا نام روشن کرو—''

''میرا تو نام ہی منور حسین خاں ہے—'' منے میاں نے بڑے فخر کے ساتھ کہا ''میں ضرور کوئی بڑا کام کروں گا اور اپنے خاندان کا نام روشن کروں گا۔''

■

ماخذ: نیا کلینڈر اور دوسری کہانیاں،

مصنف: قاضی مشتاق احمد، ناشر: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

عظیم اقبال

خون : ایک تعارف

آج کل ہر فرد سے اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے شناختی کارڈ میں اپنا بلڈ گروپ ضرور تحریر کرے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حادثے یا فوری علاج کی حالت میں اُس گروپ کا خون لا کر مریض کی جان بچائی جاسکتی ہے۔ بہ وقتِ ضرورت صحیح خون نہ چڑھ پانے سے زندگی کو درپیش خطرے کو ٹالا نہیں جاسکتا۔

یوں دیکھنے میں سارے مرد، عورت کا خون یکساں ہوتا ہے، لیکن یہ حقیقت میں یکساں نہیں ہوتا ہے۔ ہر فرد کے خون کی سرخ ٹکیوں کی سطح پر الگ الگ قسم کے اینٹی جین (Antigen) کے مادہ کے جوہر ہوتے ہیں۔ اینٹی جین کے جوہر ایک قسم کے پروٹین ہوتے ہیں۔ اینٹی جین کے ان جوہروں کے اختلاف کے سبب ہی مختلف افراد کے خون الگ اوصاف کے ہوجاتے ہیں۔

ڈاکٹر کسی فرد کو خون چڑھانے سے پہلے یہ جانچ کرتے ہیں کہ مریض کا بلڈ گروپ کیا ہے یعنی وہ 'اے'، 'ب'، 'اے بی'، 'یا اوٗ ہے اور اس کا آر ایچ فیکٹر کیا ہے۔

بلڈ گروپ کی تحقیق 1901 میں ڈاکٹر کارل لینڈ اسٹینر (Karl Land Steiner 1868-1943) نے کی تھی۔ انھوں نے پہلے 'اے' اور 'بی' دو طرح کے اینٹی جین کی دریافت کی۔ اس تحقیق کے لیے انھیں 1930 میں نوبیل انعام تفویض ہوا۔

ڈاکٹر کارل لینڈ اسٹینر کی دریافت کی بنیاد پر کہا گیا کہ جس فرد کے خون میں 'اے' قسم کے اینٹی جین ہوتے ہیں، اس کے خون کو 'اے گروپ' کہا جاتا ہے۔ پھر جن کے خون میں 'ب' قسم کے اینٹی جین ہوتے ہیں، ان کا خون 'ب گروپ' کہلاتا ہے۔

پھر پتہ چلا کہ کچھ افراد کے خون میں 'اے' اور 'بی' دونوں اقسام کے اینٹی جین ایک ساتھ ہوتے ہیں۔ تب ایسے خون کو 'اے بی' گروپ نام دیا گیا۔

بعد میں یہ دیکھا گیا کہ کچھ افراد کے خون میں 'اے' اور 'بی' اینٹی جین میں سے کوئی اینٹی جین نہیں ہوتا۔ ایسے افراد کے

خون کو 'او' گروپ کہا گیا۔

یوں سبھی افراد کے خون کو 'اے'، 'ب' 'اے بی' اور 'او' نامی گروپوں میں بانٹ دیا گیا۔ لینڈ اسٹینر نے 1937 میں الیگزنڈر ایسی، ویزے کے ہمراہ 'ریسی فیکٹر' کی دریافت کی۔ یہ ایسا مادہ ہے جو سرخ خون کے ذرّات میں ہوتا ہے۔ جس فرد کے خون میں یہ مادہ ہوتا ہے اس کی اولاد (نوزائیدہ) کو وہ مریض بنا سکتا ہے۔

کارل لینڈ اسٹینر کی دریافت کے نتیجے میں خون کی جو یہ درجہ بندی ہوئی ہے اس کا علم سب کے لیے ضروری ہے۔ اس کے پیش نظر کسی شخص کو خون چڑھانے سے پہلے اس کے خون کی جانچ ہوتی ہے۔

بلڈ گروپ کا علم اس لیے بھی ضروری ہے کہ سگے بھائی، بہن کا خون بھی الگ الگ ہوسکتا ہے۔ دوسری جانب الگ الگ طبقات کے افراد کا خون یکساں ہوسکتا ہے۔

'اے' گروپ کا خون 'اے' اور 'اے بی' گروپ والے افراد کو دیا جاسکتا ہے۔ 'اے، ب' گروپ والے افراد کو دیا جاسکتا ہے۔ 'اے ب' گروپ کا خون صرف 'اے ب' گروپ کے افراد کو ہی دیا جاسکتا ہے۔ 'او' گروپ کا خون 'او' اور 'اے بی' والے کسی بھی مریض کو دیا جاسکتا ہے۔ اس گروپ والے خون کا عطیہ کرنے والے فرد کو یونیورسل ڈونر (Universal Donor) کہتے ہیں یعنی وہ کسی بھی گروپ کے فرد کو خون کا عطیہ کر سکتا ہے۔

اسی طرح 'اے' گروپ والا فرد 'او' اور 'اے' سے 'ب' گروپ والا فرد 'بی' اور 'او' سے، 'او' گروپ والا فرد 'او' سے اور 'اے بی' گروپ والا فرد 'او' اور 'اے بی' کسی سے خون لے سکتا ہے۔

اگر غلطی سے ایک غلط گروپ کا خون کسی مریض کو دے دیا جائے تو مریض کی موت ہوجاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ الگ الگ طبقوں کے اینٹی جین ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔

خون کے مختلف گروپوں کی شناخت کرنے والے ڈاکٹر کارل لینڈ اسٹینر کی پیدائش آسٹریا میں 14 جون 1868 کو ہوئی تھی۔ انھوں نے یونیورسٹی آف ویئنا سے علم معالجات Pathology میں 1891 میں سند حاصل کی تھی۔ پھر انھوں

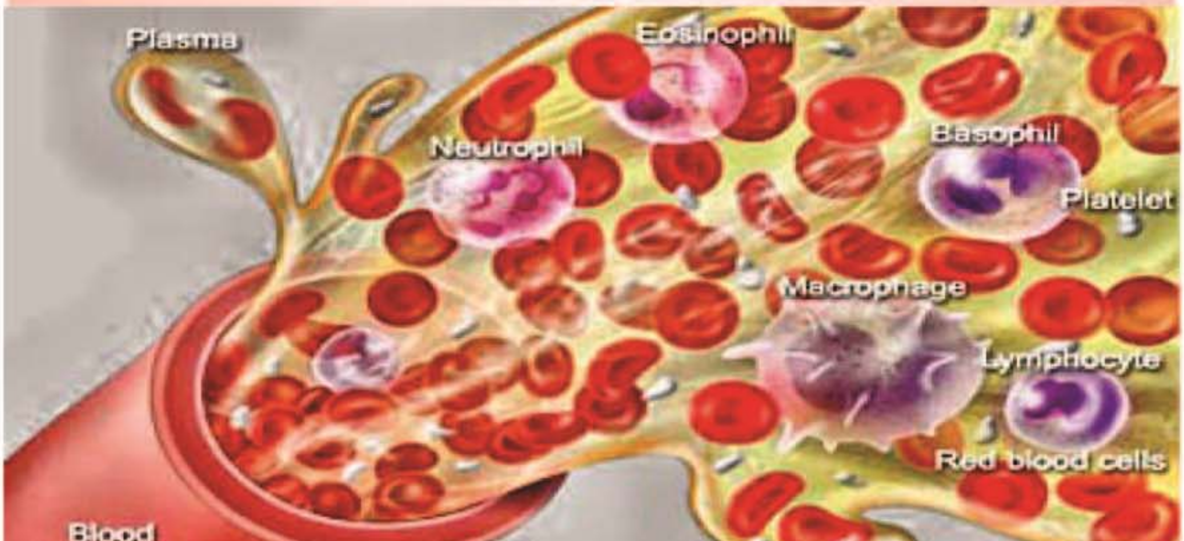

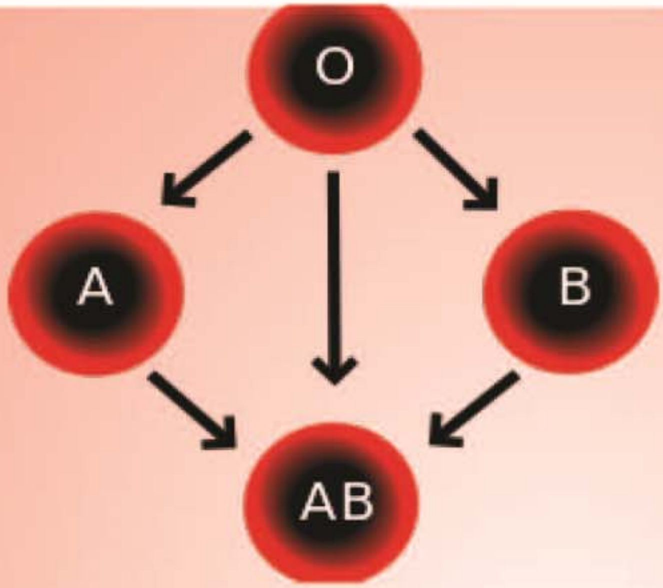

نے 5 برسوں تک میونخ کی تجربہ گاہ میں کام کیا۔

1878 سے 1908 تک لینڈ اسٹینر ویٹنا یونیورسٹی کے پیتھولوجیکل اناٹومی (Pathological Anatomy) کے شعبے میں معاون کے بطور کام کیا۔ 1911 میں وہ اس شعبہ کے پروفیسر بحال ہوئے۔ پھر وہ 1922 میں نیویارک میں واقع راک فیلر انسٹی ٹیوٹ فارمیڈیکل ریسرچ میں آ گئے۔ یہاں وہ اپنی زندگی کے آخری وقت تک رہے۔ انھیں امریکہ کی شہریت حاصل تھی۔ ہم یاددلادیں کہ لینڈ اسٹینر نے ہی پولیووائرس (Polio Virus) کی دریافت کی تھی۔

کارل لینڈ اسٹینر کی موت 26 جون 1943 کو نیویارک میں دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی۔ اس وقت وہ اپنی تجربہ گاہ میں کام کررہے تھے۔

ایک سوال عموماً پوچھا جاتا ہے کہ خون کا رنگ سرخ کیوں ہوتا ہے؟ دنیا کے سارے لوگوں کا خون سرخ ہوتا ہے لیکن خون کے سرخ ہونے کا تعلق جلد سے نہیں ہے۔

دراصل ہمارے خون کے چار مخصوص اجزا ہیں — پلازما، سرخ خون کے ذرات، پسند خون کے ذرات اور پلیٹلیس (Plateles) خون میں نصف سے زیادہ مقدار پلازما کی ہوتی ہے۔ یہ زرد رنگ کا گاڑھا مائع ہوتا ہے، اس میں پروٹین، اینٹی باڈیز، فائبری نوزن، کاربوہائیڈریٹ، چربی اور نمک وغیرہ ملتے ہیں۔

پروٹین جسمانی افزائش میں معاون ہوتا ہے۔ اینٹی باڈیز ضرررساں بیکٹیریا اور ان سے خارج شدہ زہریلے مادے کو بے اثر بناتے ہیں۔ فائبر نیوزن سے جسم کے کٹنے پر خون بہنا بند ہو جاتا ہے۔

سرخ خون کے ذرّات کے سبب ہی خون کا رنگ سرخ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں سرخ رنگ کا ہیموگلوبن نامی پگمنٹ ہوتا ہے جو خون کا رنگ سرخ بنا دیتا ہے۔

عزیز دوستو!

آیئے شکر ادا کریں اس خدائے برتر کا جس نے ہمیں زندگی دی اور شعور دیا۔ زندگی کے لیے خون ناگزیر ہے۔ شعور سے چیزوں کی آگہی ہوتی ہے اور اس کی اہمیت کی تفہیم ہوتی ہے۔

اپنی تمام تر ترقیات کے باوجود ہم تاحال اس قابل نہیں کہ مصنوعی خون بنا سکیں۔ ہم قدرت کی نقل تو کر سکتے ہیں، لیکن قدرت کا بدل تیار نہیں کر سکتے!

■

Azim Iqbal
Adabistan
Ganj No One
Bettiah - 845438 (Bihar)

شمیم احمد صدیقی

مِیں مِیں: بکری

جناب عالی! مجھے یقین ہے کہ بھلے ہی آپ نے پورے سال اوپر لکھی ہوئی میری آواز نہ سُنی ہو لیکن بقرعید کے موقع پر تو ضرور ہی سُنی ہوگی۔ میرا دعویٰ ہے کہ تمام آدمیوں کے ابّا جان یعنی حضرت آدمؑ نے بھی اس دھرتی پر قدم رکھنے کے کچھ ہی وقفہ بعد اس زمانے میں اپنے آس پاس موجود میری کسی بہن یا بھائی کی آواز ضرور سُن لی ہوگی کیونکہ دنیا کے خالق و مالک نے مجھے اور میری اولادوں کو انسان سے ہزاروں ہزار سال پہلے پیدا فرمایا تھا تاکہ میرے دودھ اور گوشت سے انسان اپنی غذائی ضرورت کو پورا کرسکے اور میرے بالوں سے کپڑا تیار کرکے اپنے جسم کو موسم کی مار سے بچاسکے۔ آپ حیوانات کا علم رکھنے والے کسی سائنسداں سے اس بات کی تصدیق کرسکتے ہیں کہ دنیا میں آدمی کی آمد سے کئی ہزار سال پہلے بکرے اور بکریاں یہاں موجود تھیں یا نہیں۔ خالق کائنات نے مجھے دنیا میں اپنے خلیفہ اور اشرف ترین مخلوق کی خدمت کا موقع دے کر میری عزت افزائی کی ہے۔ مالک دو جہاں نے مجھے ایسا جسم عطا کیا کہ میں سردی اور گرمی دونوں کو آسانی سے جھیل کر ہر جگہ رہ سکوں۔

پوری دنیا میں بکرے بکریوں کی لگ بھگ دوسو (200) قسمیں پائی جاتی ہیں جن میں سے زیادہ تر کے سروں پر سینگ ہوتے ہیں اور جسم کا رنگ سفید، کالا، بھورا یا انھیں رنگوں کے دھبّوں والا ہوتا ہے۔ ان تمام قسموں کو موٹے طور پر دو خانوں میں رکھا گیا ہے۔ ایک گروپ میں وہ قسمیں ہیں جو زیادہ دودھ دیتی ہیں جب کہ دوسرے گروپ میں وہ بکرے یا بکریاں ہیں جن کے جسم پر گھنے اور لمبے بال ہوتے ہیں اور وہ دودھ کے لیے نہیں بلکہ اپنے بالوں کی وجہ سے پالی جاتی ہیں۔ البتہ گوشت اور چمڑا دونوں طرح کی بکریوں یا بکروں سے حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ بکری کو پالنے کے لیے کم جگہ اور کم چارہ چاہیے اس لیے بکری کو غریب آدمی کی گائے بھی کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اپنی کئی خصوصیات کی بنا پر گائے اور دیگر دودھ دینے والے جانوروں پر فوقیت حاصل ہے۔ دیکھیے کس طرح:

(1) ایک گائے دن بھر میں لگ بھگ چار بکریوں کے برابر چارہ کھا جاتی ہے جب کہ اچھی نسل کی محض دو بکریاں

ایک گائے کے برابر دودھ دیتی ہیں۔

(2) ایک گائے یا بھینس کو پالنے کے لیے جس قدر جگہ چاہیے اتنی جگہ میں پانچ چھ بکرے بکریاں پالی جاسکتی ہیں۔

(3) بکری کے دودھ میں گائے اور بھینس کے دودھ کے مقابلہ مٹھاس کم ہوتی ہے لہٰذا بکری کا دودھ ذیابیطس (Diabetes) کے مریضوں کے لئے بہتر ہے۔

(4) بکری کے دودھ میں چکنائی اور نمکیات کی مقدار گائے کے دودھ کے مقابلہ لگ بھگ دوگنا ہوتی ہے۔

(5) بکری کا دودھ گائے اور بھینس کے دودھ کے مقابلہ جلد اور آسانی سے ہضم ہوتا ہے۔ اسی لیے بچوں اور مریضوں کو حکیم ڈاکٹر بکری کا دودھ پلانے کی صلاح دیتے ہیں۔

(6) بکرے بکریاں اگر زیادہ چاول نہ کھائیں تو پیٹ کی بیماریوں، بدہضمی اور قبض کی شکایت میں بہت کم مبتلا ہوتی ہیں۔ نیز نمونیا اور ٹی، بی جیسی بیماریوں سے محفوظ رہتی ہیں۔اسی لیے بکری کے دودھ کو پینے سے پہلے اُبالنا ضروری نہیں ہوتا۔ گائے، بھینس کے دودھ کو اُبالنا اس لیے ضروری ہوتا ہے تاکہ اُن میں موجود بیماریوں کے جراثیم مرجائیں اور پینے والے کی صحت کو متاثر نہ کرسکیں۔

(7) بکرے کا گوشت لذیذ ہوتا ہے اور جلد ہضم ہوتا ہے۔

(8) بکرے یا بکری کی کھال سے تیار کیا گیا چمڑا ملائم ہوتا ہے اور اعلیٰ کوالٹی کا مانا جاتا ہے۔

(9) بکری کی میگنیاں زیادہ مقدار میں بایوگیس (Bio gas) بناتی ہیں۔

(10) بکری کے فضلہ کی صفائی آسانی سے ہوجاتی ہے۔

جہاں تک ہماری غذا کا سوال ہے، ہم ہر طرح کا اناج، گھاس پھوس، پھل اور ان کے چھلکے، درختوں کے پتے، جھاڑیوں کی شاخیں حتیٰ کہ کانٹے دار جھاڑیاں بھی کھالیتی ہیں لیکن ہماری مرغوب غذا پاکڑ یا پلکھن کے پتے اور ٹہنیاں ہیں۔ گائے بھینسوں اور دیگر دودھ دینے والے جانوروں کی طرح بکریاں بھی جگالی کرتی ہیں یعنی جو کچھ غذا کھاتی ہیں وہ پہلے ایک مخصوص جگہ اسٹور رہتی ہے اور بعد میں بیٹھ کر اطمینان سے واپس منھ میں لاکر، اچھی طرح چبا کر معدے میں پہنچائی جاتی ہیں۔ بکریاں ایک سال میں عام طور پر دو بچے دیتی ہیں، کبھی کبھار تین بچے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بچے سال بھر بعد پوری طرح جوان ہوجاتے ہیں۔ بکری بچے جننے کے بعد دودھ دینے کے قابل ہوجاتی ہے اچھے خاندان کی بکریاں عموماً دس بارہ سال تک روزآنہ تین چار لیٹر دودھ دیتی ہیں۔

جناب والا! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کائنات کے مالک نے ہندوستان کو یہ شرف بخشا ہے کہ یہاں دنیا بھر کے مقابلہ سب سے زیادہ بکرے بکریاں ہیں جب کہ روزآنہ ہر شہر میں ہزاروں بکرے اپنی جان قربان کرکے انسان کو غذا فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود آپ ہی کے کچھ بزرگوں نے مجھ سے متعلق کچھ محاورے بنائے ہیں جن میں ایک دو کو چھوڑ کر بقیہ ناپسندیدہ ہی کہلائیں گے۔

* باگھ بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں: جب کسی جگہ چھوٹے اور بڑے درجہ کے لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے اور لوگ امن چین سے رہتے ہوں تب یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

* بکری جان سے گئی، کھانے والے کو مزہ نہ آیا: جب کوئی شخص کسی دوسرے کے کام کے لیے سخت مشقت برداشت کرتا ہے اور جس کا کام کیا تھا وہ شکر ادا کرنے کے بجائے کوئی ایسی

بات کہہ دیتا ہے جس سے کام انجام دینے والے کا دل دکھتا ہے تب یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔

* بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی: چونکہ بکرے کو ایک نہ ایک دن ذبح ہی ہونا ہوتا ہے اس لیے یہ محاورہ عام طور پر مجرمانہ حرکتیں کرنے والے شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ مجرم ایک دن پکڑا ضرور جائے گا اور اپنے کیے کی سزا پائے گا۔

* بکری نے دودھ دیا وہ بھی مینگنیوں بھرا: یعنی کسی کام کو اس طرح انجام دینا کہ اس میں نقصان یا بگاڑ نمایاں ہو۔

* کھائے بکری کی طرح اور رہے سوکھی لکڑی کی طرح: یہ محاورہ اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو معقول غذا کھانے کے باوجود کمزور دکھائی دیتا ہے۔

آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ دنیا کی کوئی شے عیب سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ میرے اندر بھی کچھ عیب ہیں۔ اوّل یہ کہ جب مجھے بھوک لگتی ہے یا کوئی بات منشا کے خلاف ہوتی ہے مثلاً بہت دیر تک کسی جگہ میں بند رکھا جاتا ہے اور گھومنے پھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہے تو زور زور سے میں میں کرتی ہوں اور گھر والوں کے ناک میں دم کر دیتی ہوں۔ دوم یہ کہ میرے پیشاب کی بدبو بڑی پریشان کن ہوتی ہے۔ انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں اپنی مخالفت کرنے والے حکمرانوں کو سزا دینے کا ایک انوکھا طریقہ نکالا تھا۔ وہ مخالفین کی بیگمات کو بکریوں کے ساتھ ایک تنگ کمرے میں قید کرتے تھے۔ ہمارے پیشاب کی بدبو کو مسلسل سونگھتے رہنے سے ان بیگمات کے دماغ کی رگیں پھٹ جاتی تھیں اور موت واقع ہو جاتی تھی۔ تیسرے یہ کہ جس ہریالی یا پودے پر میں منھ مار دیتی ہوں پھر اس کے پنپنے کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے میرے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ جس کو کوئی غم نہ ہو وہ بکری پال لے۔ لیکن اگر آپ میرے عیبوں کو نظر انداز کر دیں تو بلا شبہ میری خوبیاں اتنی زیادہ ہیں کہ ہر سمجھدار شخص زیادہ نہیں تو دو تین بکرے بکریاں پالنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

اب رخصت ہونے سے قبل میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ بھارت کے تیسرے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے میری بہادری کی روداد ایک کتاب کی شکل میں ''ابّو خاں کی بکری'' کے نام سے بیان کی ہے اور بھوپال کے بزرگ شاعر ظفر نسیمی نے میری شان میں میری ہی زبان میں بڑا عمدہ قطعہ کہا ہے، جب کہ سیوان کے نوجوان شاعر ڈاکٹر التفات امجدی نے اپنی رباعی کے ذریعہ میری عزت افزائی کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

بریانی میں کام آئے کبھی دودھ پلایا
شفقت سے ہمیں گود میں نبیوں نے کھلایا
انسان کی خاطر ہوئی قرباں مری نسلیں
اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز دلایا

(ظفر نسیمی)

بکری ہوں ، مقدر کی بھاری ہوں میں
صورت ہے میری بھولی ، پیاری ہوں میں
مجھ سے نہ کریں لوگ محبت کیسے
اللہ کے نبیوں کی دُلاری ہوں میں

(التفات امجدی)

■

Dr. Shamim Ahmad Siddiqui
C-2, Naseem Manzil, Madah Ganj
Police Chowki
Seetapur Road, Lucknow - 226020 (UP)

محمد عمران احمد شجر گلے گلوی

بیٹی کی حفاظت

گھر پریوار کی زینت ہے ہماری بیٹی
میرے اللہ، تیری رحمت ہے ہماری بیٹی
کون کہتا ہے نحوست ہے ہماری بیٹی
یہ تو ناہید ہے نزہت ہے ہماری بیٹی
پیار چھوٹوں کا، بزرگوں کی ہے عزت بھی یہی
لفظ و معنی کی شرافت ہے ہماری بیٹی
گھر میں مہمان کبھی آئیں تو لگتا ہے ہمیں
ان کی خدمت میں تو برکت ہے ہماری بیٹی
جن کے اعمال میں ہوتی ہے ہمیشہ نیکی
ان کے کردار کی عظمت ہے ہماری بیٹی
جن کے سر پر نہیں ہوتا کوئی سایہ تو وہاں
ان کی غم خوار ہے چاہت ہے ہماری بیٹی
چھوٹے بچوں کو سکھاتی ہے سلیقہ و ہنر
دین دنیا کی بھی راحت ہے ہماری بیٹی
ہو یہ میکے میں کہ سسرال میں ہر دل خوش ہے
گلشنِ دہر کی نکہت ہے ہماری بیٹی
زیورِ علم سے بیٹی کو سنوارو اپنی
ہم امیں اس کے، امانت ہے ہماری بیٹی
اس کے ہونے سے ہے فردوس بریں اپنا مکاں
شادمانی و مسرت ہے ہماری بیٹی
ہے یہی سچ، سبھی کہتے ہیں شجؔر دنیا میں
ملک وملت کی ضمانت ہے ہماری بیٹی

Mohd Imran Ahmad Shajar (Talegaon)
N.P. Urdu High School
Anjangaon Surji
Amravati - (Maharashtra)

ہاں ایک بیٹی ضرور ہونی چاہیے...

ہاتھوں سے اپنے کچھ کچی کچھ پکی روٹی پکا کر   کھلائے جو بڑے چاؤ سے مجھ کو بٹھا کر
تھک کر شام کو جب لیٹ جاؤ بستر پر جا کر   تو وہ یہ کہے میرے پیروں کو دبا کر
فکر تم کو اپنی پاپا کچھ تو کرنی چاہیے
ہاں ایک بیٹی ضرور گھر میں ہونی چاہیے

تتلیوں سی اڑنے، بلبل سی گنگنانے کے لیے   ضد کو اپنی ہر صورت مجھ سے منوانے کے لیے
ساتھ اس کے کھیلنے، چھپنے، چھپانے کے لیے   کبھی آ کر پیچھے سے اچانک مجھ کو ڈرانے کے لیے
گھر میں مجھ پر بھی کسی کی حکمرانی چاہیے
ہاں ایک بیٹی گھر میں ضرور ہونی چاہیے

پپیاں مجھے وہ بار بار دینے کے لیے   میرے من کو خوشیاں بے شمار دینے کے لیے
میرے اجڑے آشیاں کو بہار دینے کے لیے   بیٹی ہو کر ماں سا مجھ کو پیار دینے کے لیے
خوشیاں ایسی اب گھر میرے بھی سمونی چاہیے
ہاں ایک بیٹی ضرور گھر میں ہونی چاہیے

ماں جو مارے تو دوڑ کر میرے پاس آئے   آ کر میری پیٹھ کے پیچھے چھپ جائے
ماں کی مار سے بچنے پر وہ میرے گن گائے   پاپا، ممی سے اچھے، کہہ کر ماں کو چڑھائے
نٹ کھٹ سی چلبلی، باتونی چاہیے
ہاں ایک بیٹی ضرور گھر میں ہونی چاہیے

بن کے دھاگا موتی رشتوں کے پرونے والی   وِدائی پر لگ کر گلے میرے رونے والی
میری نصیحت، میری باتوں کو سجونے والی   میری عزت کے خاطر ستم سسرال کے سہنے والی
رات کالی ہے بہت تھوڑی چاندنی چاہے
ہاں ایک بیٹی ضرور گھر میں ہونی چاہیے

نہ پوچھے بیٹے تو گھر اپنے بلانے کے لیے   داغ بیٹوں کا دل سے مٹانے کے لیے
میت پہ میری آنسو بہانے کے لیے   کر کے تلاوتِ قرآن مجھے بخشوانے کے لیے
کرو دعا بیٹے کی پر ہو بیٹی ایسی ان ہونی چاہیے
ہاں ایک بیٹی ضرور گھر میں ہونی چاہیے

■

Moallim Shaikh Sabir
E B K Urdu School
Tembhurni Zila
Jalna - 431208 (Maharashtra)

کرشن چندر

ہرے رنگ کا جادو

جمبورا کے پاس اپنے قبیلے کا سب سے بڑا ریوڑ تھا۔ اس میں پانچ سو بھیڑیں تھیں، دو سو بکریاں، تیس گائیں اور پندرہ گھوڑے۔ جمبورا کے پاس اپنے قبیلے کی سب سے بڑی تلوار تھی۔ اس تلوار کا نام تھا پاکھرو۔ یہ تلوار اس کے بہادر باپ گھبورا کی آخری نشانی تھی۔ مرتے وقت بہادر گھبورا نے اپنے نوجوان بیٹے جمبورا سے کہا تھا، ''بیٹے، اس تلوار کو کبھی کسی عورت پر، کسی بے کس پر، کسی نہتے پر نہ چلانا، ورنہ یہ تلوار ہمیشہ کے لیے کُند ہو جائے گی اور اس کی دھار ہمیشہ کے لیے بیٹھ جائے گی۔''

جمبورا نے اپنے مرتے ہوئے باپ کے پنڈے کو چھو کر قسم کھائی تھی کہ وہ ہمیشہ ان باتوں کا خیال رکھے گا۔ اب تک جمبورا نے اس تلوار کو ہمیشہ اپنے قبیلے کے دشمنوں کے خلاف استعمال کیا تھا، یا ان بھیڑیوں کے خلاف جو اس کے گلّے پر حملہ کرتے تھے۔

جمبورا کی بیوی ہوتارا قبیلے کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، مل کر گلہ چراتے تھے اور ایک خوب صورت اونی خیمے میں رہتے تھے۔

ایک روز ہوتارا بہت سویرے اٹھ بیٹھی۔ جمبورا ابھی سو رہا تھا۔ ہوتارا نے جمبورا کو جگایا۔ جمبورا کروٹ بدل کر بولا، ''مجھے ابھی سونے دو۔''

''پہلے میرا خواب سن لو۔'' ہوتارا نے کہا۔

''تمھیں تو ہر وقت خواب دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ کہاں تک سنوں گا۔ ہٹو، مجھے سونے دو۔'' جمبورا نے مونہہ پھیر کر دوسری کروٹ لی۔

''نہیں، پہلے میرا خواب سن لو۔'' ہوتارا نے جمبورا کو زور سے جھنجھوڑ دیا۔

جبورا بستر پر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے بولا، ''کیا ہے بے وقوف لڑکی؟ بول!''

ہوتارا نے کہا، ''میں نے خواب دیکھا کہ میں صبح کے جزیرے میں ہوں، جہاں سے سورج کا چشمہ بہتا ہے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اس چشمے پر بہت سی پریاں پانی بھر رہی ہیں۔ اپنی صراحیاں بھرنے کے بعد وہ اپنی جیب سے ایک قینچی نکالتیں اور چشمے کے پانی کی دھار کو کاٹ کاٹ کر بڑے خوب صورت زیور بنا کر جسم پر سجا لیتیں۔''

''پگلی! بھلا پانی بھی کبھی قینچی سے کٹ سکتا ہے؟''

''میں نے خود دیکھا۔'' ہوتارا زور سے بولی، ''وہ پریاں قینچی سے پانی کاٹ کاٹ کر اس کی خوب صورت لہروں کو موڑ توڑ کر اس کے خوب صورت زیور بنا کر اپنے جسم پر سجا رہی تھیں۔''

''زیور تو تمھارے پاس بھی بہت ہیں۔ چاندی کے زیور ہیں۔ تانبے کے زیور ہیں۔ سفید موتیوں کا ایک کنٹھا ہے جو اس قبیلے کی کسی لڑکی کے پاس نہیں ہے۔''

''مگر وہ چاندی کے زیور نہیں تھے۔ تانبے کے زیور نہیں تھے۔ موتیوں کے زیور نہیں تھے۔ اُن کا رنگ بالکل سنہرا تھا، جیسا سورج کو ہوتا ہے۔''

''تم نے نام تو پوچھا ہوتا۔'' جبورا نے بے زاری سے کہا۔

''میں نے ایک پری سے پوچھا تھا جو میرے نزدیک کھڑی تھی۔ پہلے میں نے اس پری کا نام پوچھا۔ وہ بولی، ''میں نشا پری ہوں'' پھر میں نے پوچھا، ''تمھارے یہ خوب صورت زیور اتنے خوب صورت کیوں ہیں۔'' وہ بولی، ''کیوں کہ یہ سونے کے بنے ہیں۔''

''سونا؟ جبورا حیرت سے بولا، ''سونے کا نام ہم نے آج تک نہیں سنا۔ چاندی دیکھی ہے تانبا دیکھا ہے۔ لوہا دیکھا ہے۔ مگر سونا آج تک نہیں دیکھا۔ نیلم دیکھا ہے۔ موتی دیکھے ہیں مگر سونے کے پانی کا چشمہ آج تک نہیں دیکھا۔''

''مجھے سونا لا دو۔ کہیں سے سونا لا دو۔ سونے کا پانی لا دو۔ میں بھی ویسے ہی سندر زیور بناؤں گی۔'' ہوتارا ٹھنک کر بولی۔

یہ بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ اس زمانے میں کسی نے سونے کا نام بھی نہیں سنا تھا، نہ ایسی کوئی دھات دریافت ہوئی تھی۔ اس لیے جبورا نے ہوتارا کو سمجھایا، ''چلو سو جاؤ، اور مجھے بھی سونے دو۔ یہ سب محض ایک سپنا تھا۔ قینچی سے کٹنے والا سونے کا پانی اگر سپنا نہیں ہے تو کیا ہے؟''

جبورا کروٹ بدل کر سو گیا۔ مگر ہوتارا کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ دوسری رات بھی نیند نہیں آئی۔ تیسری رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ اِن سونے کے زیوروں کے سپنے میں کھو کر دن بہ دن پیلی اور دُبلی ہوتی گئی۔ اس نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ بس ہر روز آہیں بھرتی، آنسو بہاتی، اور جبورا سے کہتی، ''مجھے ویسے ہی زیور لا دو جیسے نشا پری نے پہن رکھے تھے — سونے کے زیور۔

جبورا کو بہت غصہ آیا۔ ایک دن تو وہ تلوار لے کر کھڑا ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ ہوتارا کی گردن اڑا دے کہ اتنے میں اُسے اپنے باپ کی وصیت یاد آئی، ''کسی عورت پر تلوار نہ اٹھانا۔''

جبورا نے تلوار نیچے کر لی۔ شرمندہ ہو کر بولا، ''مجھے میری پیٹی دے دو، اور میرے لیے ایک گھوڑے پر زین کس دو۔ میں سونے کی تلاش میں جاتا ہوں۔''

سات دن اور سات راتوں تک جبورا پہاڑی چراگاہوں سے گزرتا رہا۔ پھر دس دن اور دس راتوں تک وہ گھنے جنگل

سے گزرتا رہا۔ پھر پندرہ دن اور پندرہ راتوں تک وہ ایک صحرا سے گزرتا رہا۔ راستے میں چھاگل کا پانی ختم ہو گیا تھا اور پیاس سے وہ اور اُس کا گھوڑا دونوں مرنے والے تھے کہ اتنے میں ایک دریا سامنے نظر پڑا۔ جلدی سے گھوڑے سے اُتر کر اس نے پیاس بجھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک کشتی دوسرے کنارے سے اِس کنارے آ لگی۔ اس کشتی میں ایک بوڑھی عورت رسیوں سے بندھی پڑی تھی اور لکڑیوں کے دو بڑے گٹھے رکھے ہوئے تھے اور چار آدمی تھے جو اس بوڑھی عورت کو اٹھا کر کنارے پر لائے اور لکڑیوں کے گٹھے کھول کر انھیں آگ لگانے لگے۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' جمورا نے پوچھا۔

''ہم اس عورت کو زندہ جلانے آئے ہیں۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ یہ جادوگرنی ہے۔''

جمورا نے بوڑھی جادوگرنی کی طرف دیکھا۔ بوڑھی جادوگرنی نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے دل کا بھید سمجھ گئی۔ بولی ''اگر مجھے بچالو تو میں تمھیں وہی چیز دوں گی جس کی تلاش میں تم نکلے ہو۔

بہادر جمورا نے اپنے مرحوم باپ کی تلوار اٹھائی اور اُن لوگوں سے لڑنے لگا جو جادوگرنی کو زندہ جلانے آئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی اپنی تلواریں سونت لیں۔ مگر جمورا بہت بہادر تھا اور اس کی تلوار بھی سب سے بڑی تھی۔ دو کو تو اس نے وہیں تلوار کا لقمہ بنا دیا۔ دو بھاگ گئے۔

بہادر جمورا نے تلوار سے بوڑھی جادوگرنی کی رسیاں کاٹ ڈالیں اور اسے آزاد کر دیا۔ پھر اس نے پوچھا، ''کیا تم سچ مچ جادوگرنی ہو؟''

''ہاں۔''

''تو کون سا جادو کرتی ہو — کالا کہ سفید؟''

''ہرے رنگ کا!''

''ہرے رنگ کا جادو کیا ہوتا ہے؟'' جمورا نے حیرت سے پوچھا۔

جادوگرنی، جس کا نام ہورا تھا، بولی، ''مجھے میرے گھر لے چل جو اس دریا کے دوسرے کنارے ہے۔ پھر میں تجھے اپنا جادو دکھاؤں گی۔''

جمورا نے ہورا جادوگرنی کو اسی کشتی پر سوار کیا جس پر وہ چار آدمی اسے زندہ جلانے کے لیے لے کر آئے تھے۔ وہ اسے دریا کے دوسرے کنارے لے گیا۔ جہاں جادوگرنی کا ایک خوب صورت سا گھر تھا، جس کے چاروں طرف عجیب عجیب بیلوں اور جڑی بوٹیوں کا ایک بڑا سا باغ تھا۔

ہورا جادوگرنی اُسے اپنے باغ کے اندر لے گئی اور اسے ایک پودا دکھاتے ہوئے بولی، ''یہ پودا دیکھتے ہو؟ چھوٹے چھوٹے ہرے پتوں سے خوش بو آتی ہے۔ یہ تلسی ہے۔''

''اِسے میں نے جنگل سے ڈھونڈ کر یہاں لگایا ہے۔ اس کے پتے کھانے سے زکام اور کھانسی دور ہوتی ہے اور پیٹ کا کیسا بھی روگ ہو ختم ہو جایا کرتا ہے۔''

پھر اس نے ایک ٹیلے پر اگی ہوئی کئی جھاڑیاں دکھا کر کہا، ''جانتے ہو یہ سبز پتوں کی گھنی جھاڑیاں کون سی ہیں؟''

''کون سی ہیں؟''

''چائے کی۔''

''چائے کیا ہوتی ہے؟''

''اس کا کاڑھا بنا کر اگر صبح کو پی لو تو دن بھر بدن میں

چستی رہتی ہے۔''

جمبورا مسکرا کر بولا، ''اچھا اب میں سمجھ گیا کہ تمھارا ہرا جادو کیا ہے — ہرے پتوں کا جادو۔''

ہورا جادوگرنی اسے ایک اور کیاری میں لے گئی اور ہری ہری بالوں والا ایک پودا دکھا کر بولی، ''جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ سونے کا پودا ہے۔''

''سونے کا پودا؟'' جمبورا خوشی سے چلا کر بولا۔

''ہاں۔'' ہورا جادوگرنی بولی، ''یہ میرے باغ کا سب سے قیمتی پودا ہے۔ دو مہینے کے بعد اس میں سونے کے دانے پھوٹ آئیں گے۔''

''اسے مجھے دے دو۔ اسے مجھے دے دو۔'' جمبورا بے صبری سے چلا اٹھا، ''میں اسے ہی ڈھونڈنے آیا تھا۔ میری بیوی نے مجھے اسی کی تلاش میں بھیجا تھا۔ اسے مجھے دے دو۔''

جمبورا نے ہورا جادوگرنی کو اپنی ساری کہانی سنائی۔

ہورا جادوگرنی مسکرا کر بولی، ''تم نے میری جان بچائی ہے۔ تم اسے لے جاسکتے ہو۔ مگر احتیاط سے لے جاؤ۔ میں تمھیں دو تین پودے گملے میں ڈال کر دیے دیتی ہوں۔ پانی کی تین چھاگلیں بھی دوں گی۔ راستے میں احتیاط کرنا انھیں پانی دیتے رہنا، ورنہ پودے سوکھ جائیں گے اور تمھیں سونے کے دانے نہیں ملیں گے۔''

خوشی خوشی جمبورا واپس آیا۔ پندرہ دن اور پندرہ راتیں اس نے صحرا میں کاٹیں۔ دس دن اور دس راتیں ایک جنگل میں، پھر سات دن اور سات راتیں پہاڑی چراگاہوں سے گزر کر جب وہ اپنے خیمے میں واپس پہنچا تو اس کی بیوی ہوتارا خوشی سے اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ بولی ''سونا لائے؟''

''سونے کے پودے لایا ہوں۔''

جمبورا نے ہوتارا کو جادوگرنی کا قصہ سنایا اور سونے کے پودوں کا گملہ اس کے حوالے کرتے ہوئے بولا، ''اب احتیاط سے انھیں کبھی کبھی پانی دیتی رہنا۔ پودے سوکھیں نہیں، ورنہ تمھیں سونے کے دانے نہیں ملیں گے۔''

ہوتارا نے بڑی احتیاط سے پودوں کو پالا۔ وہ انھیں سردی سے بچاتی۔ دوسرے تیسرے روز تھوڑا تھوڑا پانی ڈالتی۔ جیسا جادوگرنی نے کہا تھا، ویسا ہی کرتی۔ پودے دن بہ دن بڑے ہوتے گئے۔ ان میں ہرے رنگ کی بالیں آنے لگیں۔ پھر ایک دن صبح سورج نکلتے وقت ہوتارا نے جو اپنے خیمے کا دروازہ کھولا تو اسے سورج کی کرنوں میں پودوں پر دمکتے ہوئے سونے کے دانے نظر آئے۔ وہ خوشی سے چیخ مار کر بھاگی بھاگی پودوں کے پاس گئی مگر قریب جا کر ناامید ہو کر لوٹ آئی اور مایوسی سے جمبورا سے کہنے لگی، ''جادوگرنی نے تمھارے ساتھ دھوکا کیا ہے یہ سونے کے دانے نہیں ہیں۔ یہ تو کوئی بیج سے ہیں۔ میں نے ایک بیج مونہہ میں رکھ کر دیکھا تھا۔ ذرا ذرا میٹھا ہے۔ مگر یہ سونے کے دانے تو ہیں نہیں۔ ان کے زیور نہیں بن سکتے۔''

ہوتارا نے مارے رنج اور غصے کے پودوں کے سارے دانے نوچ ڈالے اور انھیں اٹھا کے باہر پھینک دیا۔ پھر بستر پر لیٹ کر رونے لگی۔

ہوتارا ابھی اور روتی، مگر تھوڑی سی دیر میں قبیلے کا ڈھول بجنے لگا۔ گے ہوں سردار کے قبیلے نے جمبورا کے قبیلے پر حملہ کر دیا تھا اور قبیلے کا ڈھول سب کو خبردار کر رہا تھا۔ حملہ اتنا اچانک اور ایسی تیزی سے ہوا تھا کہ جمبورا کے قبیلے والے اپنی حفاظت بھی نہ کر سکے۔ وہ لوگ جمبورا کا سارا گلہ ہانک کر لے گئے اور گے ہوں سردار قبیلے کی سب سے خوب صورت لڑکی

جمبورا کی بیوی ہوتارا کو بھی زبردستی اٹھا کر لے گیا۔

جمبورا سخت زخمی ہوا تھا۔ رات بھر وہ درد سے اپنے خالی خیمے میں کراہتا رہا اور بھوک اور پیاس سے تڑپتا رہا۔ دوسرے دن صبح کو جب پھر طبلِ جنگ بجا تو جمبورا اپنے زخموں اور ان کے درد کے باوجود اپنے باپ کی تلوار اٹھا کر خیمے سے باہر نکلا۔ سامنے زمین پر جادوگرنی کے پودے سے نوچے ہوئے دانے چمک رہے تھے۔ جمبورا کو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے جھک کر یہ دانے زمین سے چن لیے اور انھیں مونہہ میں رکھ کر چبانے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کے بدن میں ایسی طاقت آ گئی کہ وہ اپنے درد اور زخموں کو بالکل بھول گیا اور باپ کی تلوار اٹھا کر دوڑتا ہوا میدانِ جنگ میں گھس گیا۔ آج وہ ایسی بہادری اور بے جگری سے لڑا کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ سردار گے ہوں میدانِ جنگ میں مارا گیا اور اس کے قبیلے کے لوگ سب قیدیوں اور گایوں بھیڑوں کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

جمبورا کو ہوتارا پھر واپس مل گئی۔ اب وہ بڑے پیار سے ان پودوں کو پالتی ہے جن کا بیج کھا کر جمبورا نے فتح حاصل کی تھی۔ ہوتارا نے اس فتح کی خوشی میں سونے کے دانوں کا نام رکھا ہے۔ 'سنہری گیہوں' تب سے ساری دنیا میں اس کی کاشت ہوتی ہے، کیونکہ یہ طاقت اور قوت کا پودا ہے۔ پگھلتے سورج کا چشمہ ہے۔

■

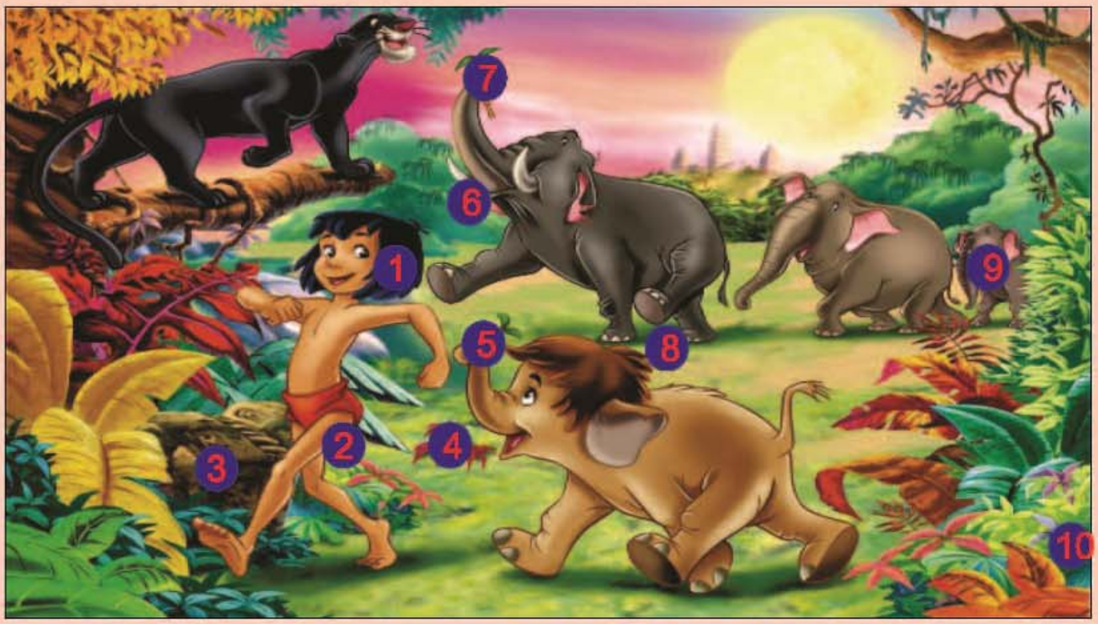

آصف نعیم صدیقی

داستان ضحاک

کئی ہزار برس پہلے ایران میں ایک بادشاہ گزرا تھا جس کا نام ضحاک تھا۔ شروع شروع میں تو وہ ایک نرم دل اور انصاف پسند بادشاہ تھا لیکن اچانک ایک ایسی بات ہوئی جس نے مزاج کو بالکل بدل ڈالا اور بجائے ایک نیک اور انصاف پسند بادشاہ کہلانے کے وہ تمام دنیا میں ظالم اور بے رحم مشہور ہوگیا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ضحاک اپنے خاص کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا سلطنت کے ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا۔ اچانک دروازہ اپنے آپ کھلا اور ایک شخص ظاہر ہوا جو شکل وصورت سے تو بہت ہوشیار اور عقل مند لیکن پراسرار معلوم ہوتا تھا۔ یہ شیطان تھا جو ضحاک کو بہکانے آیا تھا۔ ضحاک کو کیا معلوم تھا کہ وہ شیطان ہے۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اس کو اپنا دوست سمجھنے لگا۔ دھیرے دھیرے شیطان نے ضحاک کا دل جیت لیا کہ ضحاک اس کی ہر بات ماننے لگا یہاں تک کہ شیطان کے کہنے پر ضحاک نے اپنے بوڑھے اور نیک دل باپ مرداس کو جان سے مروا دیا۔ ملک کے عوام جو ضحاک کو ایک نیک دل بادشاہ سمجھتے تھے شیطان سے نفرت کرنے لگے کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ شیطان ہی نے ضحاک کو گمراہ کیا ہے۔ جب شیطان کی مخالفت بہت بڑھ گئی تو وہ ایک دن چپکے سے غائب ہوگیا۔ کچھ دنوں غائب رہنے کے بعد جب شیطان نے سوچا کہ لوگ پرانی باتیں بھول گئے ہوں گے تو اس نے ایک نئی چال چلی۔ وہ ایک باورچی کے روپ میں ضحاک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بھرے دربار میں اس نے کچھ اس طرح باتیں بنائیں کہ ضحاک بہت متاثر ہوا اور اس نے شیطان کو اپنا خاص باورچی اور مطبخ کا داروغہ مقرر کردیا۔ شیطان نے ضحاک کو اتنے عمدہ عمدہ کھانے کھلائے کہ ضحاک اس کا گرویدہ ہوگیا اور ایک دم اس کے بغیر چین نہ لیا۔ ایک دن موقع پاکر شیطان نے ضحاک سے عرض کیا کہ ”عالی جاہ! آپ مجھ سے اتنی محبت فرماتے ہیں اور مجھے بھی عالی جاہ سے بے انتہا عقیدت اور محبت ہوگئی ہے۔ اگر آپ اپنے کندھوں پر سے عبا وقبا ہٹالیں تو میں آپ کے کاندھوں کو عقیدت اور احترام سے بوسہ دوں۔ اور دین و دنیا کی

فلاح پاؤں۔"

ضحاک تو اس کے پھندے میں آہی چکا تھا اس لیے وہ بے سوچے سمجھے تیار ہوگیا۔ شیطان نے اس کے دونوں کاندھوں کو بوسہ دیا اور پھر فوراً غائب ہوگیا جس جگہ شیطان نے بوسہ دیا تھا وہاں دو پھنکارتے ہوئے ناگ بل کھا رہے تھے۔ اب تو ضحاک حواس باختہ ہوگیا اور اس قدر گھبرا گیا کہ اس نے اس کے غائب ہوجانے کا خیال بھی نہ کیا اور جا کر اپنے محل کے ایک دور دراز کمرے میں چھپ گیا اور حکم دے دیا کہ کوئی میرے سامنے نہ آئے۔

دونوں سانپ ہر دم اس کے منہ پر پھن کاڑھے کھڑے رہتے اور ایسا لگتا کہ جیسے اب ڈس ہی لیں گے۔ ضحاک کا کھانا پینا، سونا جاگنا حرام ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے حکیموں اور سانپ مارنے والوں کو بلا کر ان سانپوں کو مروایا بھی لیکن جیسے ہی وہ سانپ مارے جاتے ان کی جگہ دوسرے پیدا ہوجاتے۔

جب ضحاک علاج سے بالکل مایوس ہوگیا اور اسے یقین ہوگیا کہ اسے اب ان سانپوں سے موت کے بعد ہی نجات ملے گی تو اچانک شیطان اس کے سامنے ایک حکیم کی شکل میں ظاہر ہوا اور بولا کہ میں تم کو ٹھیک کرسکتا ہوں بشرطیکہ تم میرے کہنے پر عمل کرو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ضحاک اس کی ہر شرط اور ہر بات ماننے کے لیے بخوشی تیار ہوگیا۔ شیطان نے اس سے کہا کہ ان سانپوں کے آزار سے اسی وقت نجات مل سکتی ہے جب انھیں ہر روز انسانوں کا بھیجا کھلایا جائے۔ تمھیں روزانہ دو آدمیوں کو مروانا ہوگا اور ان کا بھیجا نکلوا کر ان سانپوں کو کھلانا ہوگا۔ جب تک انھیں یہ کھانا ملتا رہے گا وہ چپ چاپ پڑے رہیں گے۔

ضحاک کا دل تو پہلے ہی سخت ہوچکا تھا ورنہ وہ اپنے باپ کو کیوں مرواتا۔ اپنی ایک جان بچانے کی خاطر وہ سیکڑوں بے گناہوں کا خون کرنے پر راضی ہوگیا۔ پھر کیا تھا روزانہ دو بے گناہ پکڑ کر لائے جاتے اور ان کا بھیجا ان سانپوں کو کھلایا جاتا۔ ساری رعایا میں خوف و غصے کی لہر پھیل گئی لیکن بھلا کون تھا جو بادشاہ کے ظلم کے آگے آواز اٹھانے کی ہمت کرتا۔ لوگ بھاگ بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لینے لگے۔

اسی زمانے میں فریدوں نام کا ایک شخص ایران میں پیدا ہوا۔ یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں ضحاک نے خواب دیکھا تھا کہ اس کی تباہی اس کے ہاتھوں لکھی ہے۔ اسی خوف سے اس نے اپنے سپاہیوں کو بھیج کر فریدوں کے باپ آتین کو گرفتار کروالیا تھا اور اس کو مروا کر اس کا بھیجا سانپوں کو کھلوا دیا تھا لیکن اس وقت فریدوں کی ماں فرانک حاملہ ہوچکی تھی۔ فریدوں جب پیدا ہوا تو اس کی ماں (فریدوں) اسے لے کر البرز کی پہاڑیوں میں چھپ گئی۔ ضحاک کو اس کی خبر نہ تھی اور فرانک اپنے پیارے بیٹے کی پرورش پہاڑوں اور جنگلوں میں کسی نہ کسی طرح کرتی رہی۔ اب فریدوں سولہ سال کا ہوچکا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی ماں سے اپنے خاندانی حالات پوچھے اور پوچھا کہ ہم لوگ اس طرح پہاڑوں میں کیوں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ماں نے پہلے تو ٹالنا چاہا لیکن جب اس نے بہت ضد کی تو اس نے ساری بات بتا دی۔ اس نے فریدوں کو بتایا کہ ضحاک سے پہلے جمشید بادشاہ تھا لیکن ضحاک اس کو ہٹا کر بادشاہ بن بیٹھا پھر اس نے جمشید کو مروا بھی دیا۔ ہم ایرانیوں سے یہ غلطی ہوئی کہ اس وقت ہم ضحاک کے ساتھ ہوگئے تھے۔ ضحاک نے اس کی دونوں بیٹیوں 'شہرناز' اور 'ارنواز' کے ساتھ زبردستی شادی کرلی۔ جس دن سے وہ تخت پر بیٹھا ہے

ملک بھر میں نحوست چھائی ہوئی ہے۔ پھر اس نے سانپوں والا واقعہ بیان کر کے کہا کہ ہر شخص اسی خوف اور فکر میں مبتلا ہے کہ کسی وقت بھی اس کی باری آسکتی ہے۔ ہر شخص اس کے ظلم و ستم سے تنگ آچکا ہے۔ تمھارے باپ کو بھی ضحاک نے اس لیے مروا ڈالا کہ وہ چاہتا تھا کہ تم پیدا نہ ہو، کیونکہ اس نے ایک خواب دیکھا تھا کہ اس کی موت تمھارے ہاتھوں لکھی ہے۔ وہ تمھاری تلاش میں ہے اور اس نے اپنے ساتھیوں کو تمھیں ڈھونڈ نکالنے کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ یہ حالت سن کر فریدوں کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ۔اس نے اسی وقت عہد کیا کہ میں اپنے باپ کے قتل اور ضحاک کے ظلم کا بدلہ ضرور لوں گا۔

ادھر ضحاک فریدوں کے خوف سے چین کی نیند نہ سو پا رہا تھا۔ اس نے ایک دن تمام بڑے بڑے پجاریوں کو (جن کو موید کہتے ہیں) اکٹھا کیا اور ان سے پوچھا کہ فریدوں کو کس طرح ڈھونڈھ نکالا جائے۔ پھر خود ہی اس نے یہ تجویز رکھی کہ اس دشمن سے بچنے کے لیے ہمیں ایک ایسی دستاویز تیار کرنا چاہیے جس میں یہ بیان دیا جائے کہ ضحاک ایک انصاف پسند بادشاہ ہے، اس نے کسی کے ساتھ ظلم نہیں کیا ہے اور نہ ہی کسی ایسے کام کو پسند کیا ہے جو ملک کی بربادی اور تباہی کا سبب بنے۔ موبدوں نے سوچا کہ اگر وہ انکار کرتے ہیں تو ضحاک ان کا سر قلم کروا دے گا۔ جان کے خوف سے سب اس دستاویز پر دستخط کرنے کو تیار ہو گئے لیکن جیسے ہی وہ اس پر دستخط کرنے والے تھے کہ محل کے سامنے ایک بارگی ایک شور بلند ہوا اور ایک فریادی اس کے دربار میں داخل ہوا۔ فریادی کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ ضحاک نے پوچھا ''اے فریادی تیرا کیا نام ہے اور تجھے کیا چاہیے۔'' فریادی نے بتایا کہ ''میرا نام کادہ ہے'' میں تیرے انصاف کی دہائی دیتا ہوں۔ میں تیرے ظلم سے تنگ آچکا ہوں۔ میری اٹھارہ اولادیں تھیں اور اب صرف ایک ہی باقی ہے سترہ تیرے قبضے میں ہیں۔ میں ایک غریب لوہار ہوں۔ آخر مجھ غریب پر اتنے ظلم کیوں۔''

اس وقت ضحاک گھبرا گیا۔ لیکن پھر اس نے مصلحت سے کام لیا اور اپنی رحم دلی کا ثبوت دینے کے لیے اس کی اولادوں کو رہا کر دیا اور کادہ سے کہا کہ ''دیکھو میں نے تمھارے ساتھ ناانصافی سے کام نہیں لیا۔ اب تمھیں میری اس دستاویز پر دستخط کر دینا چاہیے۔ کادہ نے دستاویز اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے پڑھنے لگا۔ اس کو پڑھتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اس کے مویدوں اور پیشواؤں کو خوب برا بھلا کہا کہ لعنت ہے تم پر اور تمھاری پیشوائی پر کہ تم ظلم اور طاقت کے آگے سر جھکا دیتے ہو تمھیں تو چاہیے تھا کہ تم بادشاہ کو اس کے ظلم سے روکتے۔ تم تو اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہو۔ تمھارا جو دل چاہے سو کرو میں تو اس کاغذ پر دستخط نہ کروں گا۔ یہ کہہ کر اس نے دستاویز پھاڑ ڈالی اور اسے اپنے پیروں کے نیچے کچل کر دربار سے نکلتا چلا گیا۔

باہر آکر کادہ نے لوگوں کو سب حال کہہ سنایا اور کہا کہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اب وقت آگیا ہے کہ لوگ متحد ہو کر اس ظلم کا خاتمہ کر دیں۔ سب نے کادہ کی تائید کی۔ کادہ نے سب کو اکٹھا کیا اور چمڑے کا ایک جھنڈا تیار کروایا اور سب لوگ جوق در جوق اس کے پیچھے ہوئے۔ کادہ پہلے تو فریدوں کے پاس گیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ضحاک کی موت فریدوں کے ہاتھ لکھی ہے۔ جب وہ لوگ فریدوں کے پاس پہنچے تو سب نے ایک آواز ہو کر فریدوں زندہ باد کے نعرے لگائے اور یہ کہا کہ ہم لوگ آپ کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں۔ آپ ہمارے رہبر ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر ضحاک سے ظلم کا انتقام لیں اور اس کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔

فریدوں تو تیار ہی بیٹھا تھا۔ وہ فوراً ان لوگوں کے ساتھ ہولیا۔ ان لوگوں نے پہلے اپنے جھنڈے کو قیمتی موتیوں سے سجایا اور اسے 'درفش کاویانی' کا نام دیا پھر فریدوں آگے آگے چلا۔ اور مظلوموں کا ہجوم فوج بن کر اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ جب یہ لوگ ضحاک کے محل پر پہنچے تو ضحاک وہاں موجود نہ تھا۔ فریدوں نے شہر پر قبضہ کرلیا اور ضحاک کے محل میں داخل ہوگیا۔ پہلے اس نے جمشید کی دونوں بیٹیوں 'شہرناز' اور 'ارنواز' کو آزاد کیا۔ انھوں نے رو رو کر فریدوں کو ضحاک کی بے رحمی اور بدسلوکی کی داستان سنائی۔ فریدوں نے انھیں ڈھارس دلائی اور قسم کھائی کہ اگر خدا نے چاہا تو ہم لوگ اس ظالم کو خاک میں ملا کر چین لیں گے۔ ہر طرف خوشیاں منائی جانے لگیں۔ لیکن فریدوں نے فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا۔

کندرو جسے ضحاک اپنا نائب مقرر کر کے گیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر بہت پریشان ہو رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس میں اتنی طاقت تو تھی نہیں کہ وہ فریدوں کا مقابلہ کر سکے۔ کندرو نے جیسے تیسے وہ دن کاٹا۔ اگلے دن بہت سویرے وہ چھپ چھپا کر ضحاک کو بلانے کے لیے چل دیا۔ ضحاک کو خبر بھی نہ تھی کہ دارالسلطنت پر فریدوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ کندرو کو یہاں آتا دیکھ کر وہ بہت گھبرایا اس نے کندرو سے پوچھا خیریت تو ہے۔ اچانک تم اس طرح کیسے آگئے۔ کندرو نے اسے اسی گھبراہٹ اور حیرانی کی کیفیت میں سارا ماجرا سنایا۔ جب ضحاک نے یہ سنا کہ دارالسلطنت پر فریدوں کا قبضہ ہوگیا ہے، تو اسے بے حد غصہ آیا۔ اس نے کندرو کو خوب ڈانٹا پھٹکارا اور کہا کہ تم اتنے بزدل ہو کہ چند نہتوں کے سامنے دم دبا کر بھاگ نکلے، اس کے بعد اس نے فوجوں کو دارالسلطنت کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔

جب ضحاک اپنی فوج کو لے کر دارالسلطنت پہنچا تو وہاں اور ہی منظر تھا۔ ہر طرف فریدوں زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ شہر کیا تھا ایک میدان حشر بنا ہوا تھا۔ فریدوں کی حمایت میں عوام کی فوج اتنی کثیر تعداد میں اکٹھا ہوگئی تھی کہ ان کے چلنے سے جو گرد اٹھتی تھی وہ آسمان تک پہنچ رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ آسمان بھی سیاہ لباس پہن کر ضحاک سے اس کے مظالم کا انتقام لے رہا ہے۔ ہوا کا یہ رخ دیکھ کر مذہبی پیشواؤں نے بھی ضحاک کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ غرض یہ کہ انسان، حیوان، حجر، شجر، کوئی ضحاک کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔ پھر بھی ضحاک نے جوں توں کر کے حملہ کیا مگر فریدوں کی فوجوں نے اس کو شکست فاش دے دی۔ ضحاک گرفتار کرلیا گیا اور اسے لے جا کر کوہ دماوند میں قید کرلیا گیا۔ لوگوں نے مل کر فریدوں کو بادشاہ بنایا۔

فریدوں کی بادشاہت میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ سیکڑوں برس کی کچلی ہوئی رعایا نے اطمینان کی سانس لی۔ فریدوں نے ملک کے بڑے بڑے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے درخواست کی کہ انصاف اور امن و امان قائم رکھنے میں وہ اس کی مدد کرتے رہیں۔

ضحاک تمام زندگی کوہ دماوند میں قید رہا۔ فریدوں کی بادشاہت دور دور تک پھیلی۔ اس نے پانچ سو سال تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کی اولادیں بھی ایک زمانے تک ایران پر حکمراں ہیں۔

■

ماخذ: شاہ نامہ کی کہانیاں،
مصنف: آصف نعیم صدیقی،
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

شاد عباسی

لالچ

ساجد اپنے پرانے مکان کے ایک کمرے میں کروٹ بدل رہا تھا اور افسوس سے ہاتھ مل رہا تھا۔ نہ اس کی آنکھوں میں نیند تھی اور نہ اس کے دل کو چین آ رہا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے، شام سے اسے جھپکی بھی نہ آئی تھی وہ اپنی غلطی پر سوائے افسوس کے اب کچھ کر بھی نہ سکتا تھا۔

بچپن ہی میں ساجد کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت اس کی عمر آٹھ سال کی تھی، اس کے باپ ماں غریب آدمی تھے، سوائے ایک پرانا مکان کے وراثت میں اسے کچھ نہ ملا تھا۔ اس کے چچا نے اسے بنائی کا کام سکھانے کے لیے ایک سیٹھ کے کارخانے میں رکھ دیا تھا۔ ساجد روز صبح جاتا دن بھر کارخانے میں بنائی کا کام سیکھتا۔ پچاس روپے ماہانہ تنخواہ تھی، جو ہر مہینے وہ اپنے چچا کے ہاتھ میں لا کر دے دیتا۔ اس کا چچا بھی غریب ہی تھا۔ ساجد کو جو کچھ روکھا سوکھا ملتا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتا، باقاعدہ نمازیں پڑھا کرتا۔

یوں ہی دن و رات گزر رہے تھے، تین برس ہو گئے ساجد اب ایک اچھا کاریگر بن گیا، اب اس کی تنخواہ کے بجائے مزدوری لگ گئی تھی یعنی جتنا کام کرے گا اتنا پیسہ ملے گا۔ وہ دن رات محنت کرنے لگا، ایمانداری اور محنت کے بل پر اس نے سیٹھ کے دل میں اپنی جگہ بنالی۔ محلے والے گھر والے سب ہی اس کی شرافت اور ایمان داری سے متاثر تھے، وہ کسی سے گالی گلوج لڑائی جھگڑا نہ کرتا، اپنے بڑوں کا احترام کرتا، چھوٹوں سے شفقت اور مہربانی سے پیش آتا۔ اپنی محنت اور ایمان داری کے بل پر وہ اب پانچ سو روپیہ ماہانہ کا کام کر لیتا تھا، اس کی ایمانداری ہی کا نتیجہ تھا کہ ان پانچ سو روپیوں میں اللہ تعالیٰ نے اسے اتنی برکت دی کہ چین سے کھا پی کر بھی وہ کچھ پیسے بچا لیتا، دھیرے دھیرے کچھ پونجی لگا کر اس نے اپنے گھر میں ایک کرگھا لگا لیا اور اسی پر ساڑیاں تیار کر کے خود بازار جا کر بیچنے لگا، اب اس کو مزدوری کے علاوہ ساڑیوں میں اچھا منافع بھی ہونے لگا۔ ایک کے بعد ایک اس نے تین کرگھے لگا لیے، ایک کرگھا پر وہ خود اور دوسرے دو کرگھوں پر کاریگروں سے کام لینے لگا۔ وہ اصلی سلک اور اصلی زری کا مال بنانے کے لیے مشہور ہو گیا۔ ہر دوکان دار چاہتا تھا کہ ساجد کا مال میں خریدوں کیونکہ ان میں ان کو بھی اچھا منافع ملتا تھا اور کوئی دھوکہ بھی نہ تھا، بالکل اصلی زری اور اصلی سلک کا مال ہوتا۔

ایک بار بازار سخت مندا ہوگیا، مال بکنا بند ہوگیا، ساجد کے پاس بھی کئی ساڑیاں رک گئیں، کارخانہ چلانا دشوار ہوگیا۔ ایک دن وہ کچھ ساڑیاں لے کر بازار میں گھوم رہا تھا لیکن کوئی خریدار نہ ملا، تھک ہار کر وہ واپس آرہا تھا کہ ایک اجنبی شخص بازار کے نکڑ پر کھڑا ہوا ملا۔ اس نے ساجد کے ہاتھ میں دبی ہوئی پیٹی کی طرف اشارہ کرکے پوچھا، اس میں کیا ہے؟ ساجد نے جواب دیا، ساڑیاں ہیں۔ اجنبی نے دوسرا سوال کیا، اصلی ہیں یا نقلی؟ ساجد نے کہا، اصلی ہیں۔ کیونکہ وہ کبھی جھوٹ نہ بولتا تھا۔ جو چیز جیسی رہتی صاف صاف بتا دیتا۔ کبھی دھوکہ دے کر مال بیچنے کی کوشش نہ کی۔ اس اجنبی نے کہا کہ میری دوکان پر اگر چلو اور میرے سیٹھ کو یہ مال دکھا دو تو ہوسکتا ہے تمھارا یہ مال سب بک جائے۔ ساجد تو ایک بار ڈرا پھر اللہ پر بھروسہ کرکے تیار ہوگیا۔

وہ اجنبی ساجد کو اپنی کار پر بیٹھا کر شہر کی بھیڑ بھری اور ٹیڑھی میڑھی سڑکوں سے گزرتا ہوا شہر کے باہر نکل گیا۔ ساجد ڈرنے لگا کہ کہیں یہ کوئی دھوکے باز یا کوئی لٹیرا نہ ہو، سناٹے میں لے جاکر میرا مال نہ چھین لے، لیکن زبان سے اس نے کچھ نہ کہا، من ہی من میں وہ اللہ سے دعائیں مانگنے لگا جو دعائیں اسے یاد تھیں دہرائے جارہا تھا۔

شہر سے بہت دور ویرانے میں بڑے بڑے درختوں سے گھرے ہوئے ایک محل میں جاکر اس نے گاڑی روکی اور ساجد کو اندر لے گیا، ساجد اس جگہ کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ بڑے بڑے کمرے، جگمگاتے قمقمے، نوکر چاکر، مال کی خرید و فروخت، ساجد کو مالک کے پاس لے جایا گیا۔ ساجد نے اپنا مال دکھایا جو پسند آگیا، اسی وقت اسے پوری قیمت بھی مل گئی۔ ساتھ ہی بہت بڑا آرڈر بھی مل گیا۔ آرڈر وغیرہ لکھا کر ساجد سے کھانا کھانے کے لیے کہا گیا۔ ساجد پر اس جگہ اور ان لوگوں کا ایسا رعب طاری تھا کہ وہ انکار نہ کرسکا۔

ایک سجے سجائے بڑے ہال میں مالک اور تمام دوسرے لوگوں کے ساتھ ساجد بھی کھانا کھا رہا تھا، آج تک اس نے اتنا پرتکلف کھانا نہ کھایا تھا اور نہ کبھی اس کا تصور کیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ساجد کو اسی گاڑی سے شہر پہنچا دیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ تمھیں یہاں روز آنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے آدمی کو اپنا گھر دکھا دو وہ پیسے دے کر مال لے آیا کرے گا۔

ساجد کی خوشیوں کا کوئی اندازہ نہ تھا کیونکہ اس مندی بازار میں اسے بہت زیادہ منافع کے ساتھ ایک بڑا آرڈر ملا تھا۔

ساجد نے مال بنوانا شروع کردیا، ہر دس پندرہ دن پر وہ اجنبی آتا اور روپے دے کر سارا مال لے جاتا۔ رفتہ رفتہ ساجد نے اور زیادہ مال تیار کرانا شروع کردیا۔ اب ہر ٹرپ میں اسے چالیس ہزار پچاس ہزار کا پیمنٹ ملنے لگا۔ پانچ ہی برس میں ساجد شہر کا سب سے بڑا بیوپاری بن گیا۔ دوسرے سیٹھ پریشان تھے کہ ساجد کہاں مال بیچتا ہے؟ لیکن کسی کو خبر نہیں کیونکہ وہ اجنبی رات میں کسی وقت آتا اور سارا تیار مال لے کر پیسے ادا کرتا اور چلا جاتا۔ پانچ ہی سال میں ساجد نے ایک بہت ہی عالیشان حویلی تعمیر کرائی جسے دیکھ کر لوگ حیرت میں پڑ جاتے، اس میں خوب خوب عیش کے سامان اکٹھا تھے، کار، فریزر، قیمتی فرنیچر، نوکر چاکر اس کا ہاتھ بھی کچھ اونچا ہوگیا۔ کچھ فضول خرچ بھی ہوگیا۔ اس لیے اسے اور زیادہ منافع کمانے کی فکر ہوگئی اور روز بروز اس کی فکر میں اضافہ ہوتا گیا، سچائی ایمانداری اور اصلی زری کے مال کے لیے وہ مشہور ہوچکا تھا۔ ایک دن شیطان نے اسے بہکایا کہ کیوں نہ اصلی زری کی جگہ نقلی زری لگا دی جائے، اتنا بڑا آرڈر ہے خریدار کو کیا پتہ

چلے گا کہ یہ نقلی زری ہے۔ ایک ساڑی میں دس گنا منافع بڑھ جائے گا، ایک سال میں لاکھوں کا فائدہ ہوگا۔ یہ سوچ کر پہلے اس نے ایک ساڑی نقلی زری کی بنوائی اور اصلی ساڑیوں کے ساتھ اسے بھی دے دیا۔ آٹھ دس دن ہوگئے خریدار کی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ اس کی لالچ اور حرص اور بڑھی اور اس نے اب اصلی زری کی جگہ نقلی زری کا مال بنوانا شروع کردیا۔

ایک دن اجنبی آیا اور ساجد سے کہا کہ مال بنوا کر تیار رکھنا ہمارے مالک باہر جارہے ہیں۔ تین مہینے بعد آئیں گے تو سارا مال لے جاؤں گا۔ ساجد نے خوشی خوشی مال بنوا کر رکھنا شروع کردیا۔ دو مہینے بعد اس کو کچھ پیسوں کی تنگی ہوگئی کیونکہ مال گھر میں تیار پڑا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اب ایک مہینہ اور رہ گیا ہے۔ مال چلا جائے گا تو بہت سارے روپے اکٹھے مل جائیں گے۔ اس نے اپنی تمام پونجی جو گھر میں تھی لگا دی اور جو بینک میں تھی وہ بھی لگا دی۔ تین چار لاکھ کا ریشم اور زری ادھار بھی لے لیا یہ سوچ کر کہ جب خریدار آجائے گا تو پچاس، ساٹھ لاکھ اکٹھے دے کر مال لے جائے گا۔

جب تین مہینے گزر گئے اور خریدار نہیں آیا تو اسے کچھ تشویش ہوئی مگر وہ مال بنواتا رہا، ساڑھے تین مہینے ہوگئے اب اس کی بے چینی اور بڑھی۔

ایک دن وہ اپنی گاڑی پر بیٹھ کر اندازے سے اسی راستے پر چلا جدھر پہلے روز وہ اجنبی اسے لے گیا تھا۔ شہر سے باہر ویرانے میں اسے ایک جگہ دکھائی دی، درختوں کی گھنی قطاروں کو پار کر کے وہ محل کے پاس گیا تو دیکھا کہ ایک بہت ہی پرانا کھنڈر ہے، ڈرتے ڈرتے اندر گیا، کمرے تو وہی تھے مگر ہر طرف ویرانی دھول، الو کے گھونسلے، بدبو اور ڈراونا ماحول، اس کے کانوں میں کچھ عجیب عجیب سی آوازیں بھی آرہی تھیں، نہ آدم نہ آدم زاد وہ گھبرا کر باہر نکل آیا۔ ایک بوڑھے راہ گیر سے ساجد نے پوچھا کہ یہاں تو ایک محل تھا جس میں ساڑیوں کا کاروبار ہوتا تھا یہ کھنڈر کیسا ہے؟ بوڑھا راہ گیر ہنسا اور کہا کہ میں بچپن سے یہ کھنڈر دیکھتے دیکھتے بوڑھا ہوگیا اور تم کہتے ہو یہ محل تھا۔ مشہور یہ تھا کہ یہ جنوں کا گھر ہے۔ یہاں راتوں میں طرح طرح کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ رات میں کوئی اس راستے سے نہیں آتا جاتا، یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔

یہ سن کر ساجد کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ بار بار اندر جاتا اور باہر آتا، وہی کمرے وہی راہ داریاں مگر کھنڈر۔ وہ پاگلوں کی طرح اس کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ خوب زور زور سے چلائے اور ان لوگوں کو پکارے جن لوگوں نے ایک دن اسی جگہ اسے کھانا کھلایا تھا اس سے کروڑوں کا مال خریدا تھا مگر آواز اس کے حلق ہی میں اٹک کر رہ گئی۔ نڈھال ہو کر وہ گھر واپس آگیا۔ ایک مہینہ اور انتظار کیا لیکن خریدار نہ آیا اب مہاجنوں نے تقاضا شروع کردیا۔ بازار میں بھی مشہور ہوگیا کہ ساجد نقلی مال بنوانے لگا ہے، اس کے مال کا کوئی خریدار نہ تھا۔

مجبوراً اسے اپنا خوبصورت بنگلہ فروخت کرنا پڑا۔ جو مال تھا سب نقلی تھا کچھ دنوں میں سب خراب ہوگیا۔ وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگیا۔ آج وہ اپنے اسی پرانے مکان میں پڑا کروٹ بدل رہا تھا، اس کی آنکھوں سے نیند بھی روٹھ چکی تھی، لالچ اور جھوٹ کی غلطی نے اسے آسمان سے زمین پر پھینک دیا۔

■

Shad Abbasi
Zarnigar Computer Training Centre
B-16/130, Malti Bagh
Varanasi - (UP)

شمس الدین شمس

سچا دوست

پیارے بچو! بچپن سے جڑی کچھ عادتیں ایسی ہوتی ہیں جو آگے چل کر جلدی چھوٹتی نہیں۔ جیسے پیر ہاتھ ٹھیک سے صاف نہیں کرنا، صبح میں ٹوتھ برش کرنے میں آنا کانی کرنا، کسی دوسرے کے یہاں جانا اور گھر والے کے بغیر اجازت کوئی سامان اٹھا کر چھپا لینا یا پھر اسکول میں اپنے ساتھیوں کے قلم اور کتابیں غائب کر دینا۔ اسی طرح بچپن کی اور بھی بری عادتیں ہوتی ہیں، جس پر شروع میں دھیان دینے سے وہ سب خراب عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ ورنہ آگے چل کر وہ سب بری عادتیں بچوں کو کہیں کا نہیں چھوڑتیں۔ ایسے بچوں کو زندگی بھر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے بچو! ان عادتوں کے علاوہ بچپن کے دنوں میں اور بھی بری عادتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اسی وقت بچوں کے والدین یا اس کے ساتھی ان بری عادتوں کی طرف توجہ دلا دیتے ہیں تو ایسے ساتھی سچے دوست ہوتے ہیں۔ اسی بات پر میں آپ کو دو سچے دوستوں کی ایک کہانی سناتا ہوں۔

آج پھر عامر کا قلم اس کے بستے سے اکرم کے غائب کرنے کا ذکر اس کے ہم جماعت کر رہے تھے کہ اس کی یہ بری عادت کب چھوٹے گی۔ اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کے قلم اور کتابیں کیوں چراتا ہے؟ اسکول کے سبھی طالب علم اس سے پریشان رہتے تھے۔ خاص کر عامر اس سے زیادہ پریشان رہتا تھا۔ چونکہ اکرم عامر کے پاس ہی بیٹھتا تھا۔ اس کی جماعت کے تقریباً سبھی طالب علم اکرم کو اپنے قریب بیٹھنے نہیں دیتے تھے لیکن عامر کے قریب وہ بیٹھ جاتا تھا، جس کی وجہ سے عامر کو سبھی ساتھی ڈرپوک و بزدل سمجھتے تھے۔ گھر میں بھی عامر کو اپنے والدین سے ڈانٹ سننی پڑتی تھی کہ وہ اکثر اپنا قلم کھو دیتا ہے۔ اس طرح عامر بڑی الجھن میں تھا کہ آخر اکرم کی یہ بری عادت کس طرح چھڑائی جائے۔ اسے اس کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ تبھی ایک روز عامر کو ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔

دوسرے روز عامر اسکول بالکل وقت پر پہنچا تو دیکھا کہ اکرم پہلے سے وہاں موجود ہے۔ بس عامر بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا قلم اور ایک خط، جس میں اس نے لکھا:

میرے پیارے اکرم! خوش رہو

میں یہ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آج سے روزانہ تمہارے اسکول بیگ میں اپنا قلم میں خود سے رکھ دیا کروں گا تاکہ تمھیں میرا قلم چرانے کا گناہ نہ ہو چونکہ کسی کی بھی کوئی چیز یا روپے پیسے چرانا گناہ ہے۔ اس لیے میں خود سے اپنا قلم تمھارے اسکول بیگ میں رکھ دیا کروں گا۔

فقط والسلام

تمھارا دوست، عامر

عامر نے یہ خط اور اپنا قلم سب کی نگاہ سے بچاتے ہوئے اکرم کے اسکول بیگ میں رکھ دیا۔ وہ سنیچر کا دن تھا۔ اسکول میں ٹفن کے بعد جلد ہی چھٹی ہوگئی۔ اکرم نے جلدی سے اپنا بستہ اٹھایا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ عامر بھی اسکول سے اپنے گھر پہنچ کر پیر ہاتھ دھو ہی رہا تھا کہ اس کے گھر میں گھنٹی بجی۔ عامر نے دروازہ کھولا تو سامنے اکرم کو کھڑا پایا۔ عامر نے یہ دیکھا کہ اکرم کے ہاتھوں میں بہت سارے قلم ہیں۔ تبھی اکرم نے روتے ہوئے کہا ”عامر! تو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے معاف کرنا۔ میں نے اب تک تمھارے ڈھیر سارے قلم چرا کر تمھیں بہت پریشان کیا۔ گھر میں بھی میری وجہ سے تمھیں ڈانٹ سننی پڑتی تھی۔ لو یہ سب تمھارے قلم ہیں اور جس کا بھی قلم یا کتابیں میں نے چرائی ہیں سب واپس کردوں گا۔“ عامر نے آگے بڑھ کر اکرم کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”آج میں تم سے بے حد خوش ہوں۔ اس خوشی کے موقعے پر یہ سب قلم تمھیں گفٹ دیتا ہوں۔ تم انکار نہ کرنا۔ اگر تم یہ سب قلم میری طرف سے گفٹ میں رکھ لیتے ہو تو میں سمجھوں گا کہ تم میرے سب سے عزیز دوست ہو۔ پھر اسکول کے ساتھی مجھے بزدل نہیں سمجھیں گے۔ جو مجھے بزدل سمجھتے تھے۔“ اکرم نے بھی بڑی گرم جوشی کے ساتھ عامر کو گلے لگاتے ہوئے کہا ”واقعی تم میرے سچے دوست ہو۔ آج مجھے اپنی بری عادت سے دوسروں کے سامان چرانے پر جتنا افسوس ہو رہا ہے اتنی ہی خوشی مجھے تمھاری دوستی پر ہو رہی ہے۔“

■

Shamsuddin Shams Jhajhwee
Al-Purani Bazar
Po.: Jhajha - 811308
Distt.: Jamui (Bihar)

■ ارشد جمال حشمی

تتلی

دیکھو دیکھو تتلی ہے وہ
رنگ برنگی چنچل ہے وہ

بیٹھ گئی وہ کیلنڈر پر
اپنے دونوں پنکھ اٹھا کر

کدھر سے آئی کہاں سے آئی
جانے کس گلستاں سے آئی

کھڑکی سے آئی ہے اندر
آگئی ہو گی راہ بھٹک کر

پنکھ ابھی وہ پھیلائے گی
پل دو پل میں اڑ جائے گی

ڈھونڈھ نکالے گی وہ گلشن
جہاں لگے گا اس کا بھی من

وہ پھولوں پر منڈلائے گی
دوشِ ہوا پر لہرائے گی

خوش ہوں گے پھول اس کو پا کر
جھومیں گے شانوں پہ بٹھا کر

■

Arshad Jamal Hashmi
8, A.K. Md. Siddique Lane
Ground Floor, Opp. G.D Academy
Kolkata - 700016 (West Bengal)

ظہیر حسن ظہیر

آ گئی سردی

دیکھو دیکھو سردی آئی
برف کی پہنے وردی آئی
سردی کی من مانی دیکھو
کہرے کی سلطانی دیکھو
جما ہوا ہے پانی دیکھو
سڑکوں پر ویرانی دیکھو
دیکھو سب نے آگ جلائی
دیکھو دیکھو سردی آئی

سورج بھیا جلدی آؤ
اب نہ ہم سے آنکھ چراؤ
سردی کو تم دور بھگاؤ
سب کو گرمی سے نہلاؤ
کہنا مانو میرے بھائی
دیکھو دیکھو سردی آئی

سردی سے بدحال ہوئے ہیں
چہرے سب کے لال ہوئے ہیں
مہنگے سوئٹر شال ہوئے ہیں
سب کے سب کنگال ہوئے ہیں
بڑھتی جائے ہے مہنگائی
دیکھو دیکھو سردی آئی

دن ہے اب تو رات کے جیسا
موسم ہے برسات کے جیسا
غربت کے حالات کے جیسا
مفلس کے صدمات کے جیسا
کہرے نے پھر دھاک جمائی
دیکھو دیکھو سردی آئی

کہنا مانو پیارے بچو!
سردی میں نہ باہر نکلو
جلدی جاکر سوئٹر پہنو
لگ جائے گی سردی تم کو
اوڑھو کمبل اور دُلائی
دیکھو دیکھو سردی آئی

■

Zaheer Hasan Zaheer
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

رونق جمال

چالاک عقاب

لکھنؤ کے ایک نواب صاحب کبوتروں کے بے حد شوقین تھے۔ ان کے پاس کئی قسم کے خوبصورت خوش رنگ کبوتر تھے۔ نواب صاحب پورے شہر میں کبوتر والے نواب صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ نواب صاحب کو اپنے کبوتروں سے بے حد پیار اور لگاؤ تھا۔ کبوتر والے نواب صاحب کہلانے پر وہ فخر محسوس کرتے تھے۔ ہر روز شہر اور بیرون شہروں سے کئی لوگ نواب صاحب کی حویلی پہنچ کر کبوتروں کا دیدار کیا کرتے تھے۔ کبوتر بھی آنے والوں کی پرواہ کیے بغیر اپنی مستی میں چور رہتے تھے۔ کوئی پَر پھیلائے رقص کرتا تو کوئی ادھر ادھر غٹرغوں غٹرغوں کر کے دوڑتا۔ کوئی کبوتر خانے میں آرام کر رہا ہوتا تو کوئی انڈے سے رہا ہوتا۔ کوئی آسمان کی بلندیوں میں قلابازیاں لگا رہا ہوتا تو کوئی دانا چگ رہا ہوتا، تو کوئی پانی سے بھرے کونڈے میں غسل کر رہا ہوتا۔ سفید لال کالے کبرے خوش رنگ کبوتر اس میں کسی کے سر پر چوٹی تو کسی کے پیر پروں سے ڈھکے، کسی کی آنکھیں لال تو کسی کی آنکھیں کالی۔ بچوں کے منہ میں چونچ کے ذریعے دانہ ڈالتے کبوتروں کو دیکھ کر ممتا کا بے حد احساس ہوتا تھا۔ پندرہ اگست اور چھبیس جنوری کو نواب صاحب الگ الگ رنگوں کے دس بیس کبوتروں کو پنجرے میں ڈال کر خادم کے سر پر لاد کر کلکٹر آفس لے کر جاتے اور کلکٹر صاحب کے ہاتھوں میں دے کر اڑاتے تو پریڈ کا میدان تالیوں سے گونج اٹھتا تھا۔ دوسرے روز کلکٹر صاحب کی کبوتر اڑاتی ہوئی تصویر اخباروں کی زینت بنتی جس میں نواب صاحب کلکٹر صاحب کے ساتھ کھڑے مسکرا رہے ہوتے!

نہ جانے نواب صاحب کے کبوتروں کو کس کی نظر لگ گئی تھی کہ کہیں سے ایک عقاب آٹپکا اور روز ایک ایک کر کے کبوتروں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ نواب صاحب کبوتروں کی گھٹتی تعداد سے پریشان ہو گئے تھے۔ وہ اپنے خادموں کے ساتھ گھنٹوں بندوق لیے حویلی کی چھت پر بیٹھے رہتے تھے کہ کب ان کو عقاب نظر آئے اور وہ اسے مار گرائیں۔ لیکن ناممکن عقاب کبھی نشانے پر آیا ہی نہیں۔ عقاب بھی نہایت چالاک تھا۔ وہ کبوتروں کا شکار آسمان کی بلندیوں میں کیا کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نواب صاحب کے کبوتر گھٹ کر صرف دو ہی رہ گئے تھے ایک کالا کبوتر اور ایک سفید کبوتر ——! دونوں عقاب کے حملوں سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے ایک دوسرے کی

حفاظت بھی کیا کرتے تھے۔حفاظت کا جذبہ دوستی میں تبدیل ہوگیا اور دونوں میں گہری دوستی ہوگئی تھی۔ اب دونوں ساتھ رہتے، ساتھ اڑتے، ساتھ ساتھ دانہ چگتے تھے۔ جب کبھی عقاب ان میں سے کسی ایک پر حملہ کرتا تو دونوں مل کر عقاب پر حملہ آور ہوتے اور عقاب کا حملہ ناکام کر دیتے۔ عقاب کبوتروں کی دوستی اور ایکتا دیکھ کر حیران اور پریشان تھا۔ وہ ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ کس طرح ان میں پھوٹ ڈال کر ان کا لقمہ بنایا جائے۔ ایک روز عقاب نے پرواز کے دوران سفید کبوتر سے کہا تم بہت خوبصورت اور معصوم بھی ہو! اس کالے کبوتر کے ساتھ تمھاری کوئی جوڑی نہیں ہے۔ جب جب وہ کالا کبوتر تمھارے ساتھ ہوتا ہے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ اب بھی دیکھو کیسے ہمارے پیچھے آرہا ہے۔تم اگر اس احمق کالے کبوتر سے دوستی ختم کردو تو میں تم سے دوستی کرنے کو تیار ہوں اور وعدہ کرتا ہوں تمھیں کبھی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا، دوستی کی لاج رکھوں گا اور دوستی کا حق ادا کروں گا!! سفید کبوتر عقاب کی میٹھی میٹھی چکنی چوپڑی باتوں میں آگیا اور سوچنے لگا کالے کبوتر کی وجہ سے میری جان کو خطرہ بنا رہے گا، اگر میں عقاب کی دوستی قبول کرلوں گا تو میری جان محفوظ ہوجائے گی اور چیل کوے بھی مجھ سے دور رہیں گے۔ میں عقاب کو کہہ کر خالہ بلی کو بھی سبق سکھلا دوں گا!

عقاب اور سفید کبوتر میں دوستی ہوگئی۔ کالا کبوتر ہوشیار تھا۔عقاب کی چالاکی کو بھانپ گیا اور سفید کبوتر کو خبردار کرتے ہوئے کہا تم زندگی کی بہت بڑی بھول کر رہے ہو—! میں تمھیں اپنی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں تم عقاب کے جال سے بچو ورنہ وہ ایک ایک کرکے ہم دونوں کا شکار کرلے گا۔سفید کبوتر پوری طرح عقاب کے جال میں پھنس چکا تھا۔اسے کالے کبوتر کا مشورہ پسند نہیں آیا اور وہ کالے کبوتر سے دور دور رہنے لگا لیکن کالا کبوتر ہمیشہ ان دونوں کی نگرانی کرتا رہتا۔ ایک دن عقاب نے سفید کبوتر سے کہا یہ کالا کبوتر اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتا ہے، ہمیشہ جاسوسی کرتا رہتا ہے۔تم اجازت دو تو سبق سکھا دوں اسے—!! سفید کبوتر پوری طرح عقاب کے جال میں پھنس چکا تھا۔اس لیے عقاب کی باتیں سن کر مسکرا دیا۔عقاب سفید کبوتر کی مسکراہٹ کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ ایک دن پرواز کے دوران عقاب نے سفید کبوتر سے کہا جب ہم آسمان کی بلندیوں میں ہوں گے تم مجھ سے آگے نکل جانا میں اس کالے کھسوٹ کو سبق سکھا کر لوٹ آؤں گا۔

ایک روز عقاب سفید کبوتر کو بہت بلندی پر لے گیا اور بولا تم آگے نکل جاؤ وہ کم بخت ہمارے پیچھے آرہا ہے۔ میں آج اسے سبق سکھا ہی دیتا ہوں۔ یہ سنتے ہی سفید کبوتر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔عقاب پیچھے مڑا اور کالے کبوتر پر جھپٹا۔ کالے کبوتر نے سفید کبوتر کو مدد کے لیے آواز لگائی لیکن سفید کبوتر بہت آگے نکل چکا تھا۔عقاب نے کالے کبوتر پر پوری قوت سے چھلانگ لگائی اور اسے پنجوں میں جکڑ کر فوراً زمین کی طرف پرواز کرکے ایک بڑے سے پیڑ کی ٹہنی پر بیٹھ کر کالے کبوتر کو چیر پھاڑ کر کھا گیا اور دوبارہ اڑ کر آسمان میں سفید کبوتر کے قریب گیا اور بولا... اس کو اچھا سبق سکھا کر آرہا ہوں۔اب کبھی ہمیں اپنی منحوس شکل نہیں دکھائے گا.....!!!

سفید کبوتر حویلی پہنچا تو کالے کبوتر کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ نواب صاحب سفید کبوتر کو تنہا دیکھ کر آگ ببولا ہوگئے... بندوق نکال کر لائے اور آسمان میں گولیاں داغنے لگے لیکن وہاں عقاب تھا نہیں۔ ہوتا بھی کیسے۔ کہاں عقاب اور کہاں نواب صاحب!! آج پہلی بار سفید کبوتر اکیلا تھا۔ پورے کبوتر

خانے میں اس کا راج تھا۔ نواب صاحب کے خادم اس کی بھرپور خدمت کررہے تھے۔ دوسرے روز صبح صبح عقاب آدھمکا۔ سفید کبوتر نے عقاب کو دیکھا تو فوراً اڑ کر اس کے قریب چلا گیا۔ عقاب نے اسے اشارہ کیا اور قوت لگا کر آسمان کی بلندی میں پرواز کرنے لگا۔ سفید کبوتر بھی پوری شدت کے ساتھ اڑتا ہوا عقاب کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ تھوڑی دور جا کر عقاب مڑا اور سفید کبوتر کو پنجوں میں جکڑ کر اسی پیڑ کی اسی ٹہنی پر لے کر پہنچا جہاں اس نے کالے کبوتر کو چیر پھاڑ کر کھایا تھا۔ سفید کبوتر آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کرنے لگا، عقاب کو دوستی کی دہائی دینے لگا۔ اسے اس کا وعدہ یاد دلانے لگا لیکن سب بے سود۔ وہ عقاب کے مضبوط پنجوں میں تھا۔ سفید کبوتر کو کالے کبوتر کی ایک ایک بات یاد آنے لگی تھی۔ وہ اپنی نادانی پر بہت پچھتا رہا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ اس نے عقاب کی باتوں میں آکر کالے کبوتر سے دوستی ختم کردی تھی۔ اپنے سچے دوست، سچے ہمدرد کالے کبوتر کو دھوکہ دیا تھا جس کا انجام آج اسے زندگی سے ہاتھ دھو کر بھگتنا پڑ رہا تھا۔ سفید کبوتر ابھی اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ عقاب نے سفید کبوتر کا پیٹ چونچ سے پھاڑ دیا۔ سفید کبوتر درد سے تڑپا اور ٹھنڈا ہوگیا!!

دیکھا بچو! آپ نے۔ اچھوں سے دوستی ختم کرکے بروں سے دوستی کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے—! آپ بھی ہمیشہ اچھے سچے دوستوں کو چنیے۔ برے دوستوں سے دور رہیں بلکہ ان سے رشتہ توڑ دیں۔ آپ کی زندگی کامیاب رہے گی۔ ہمیشہ مسکراتے رہیے اور اپنا خیال رکھیے۔!!!

■

Raunaq Jamal
'Kainath' Street No.9, New Adarsh Nagar
Durg - 491001 (Chhattishgarh)

واہ واہ لڑکیاں

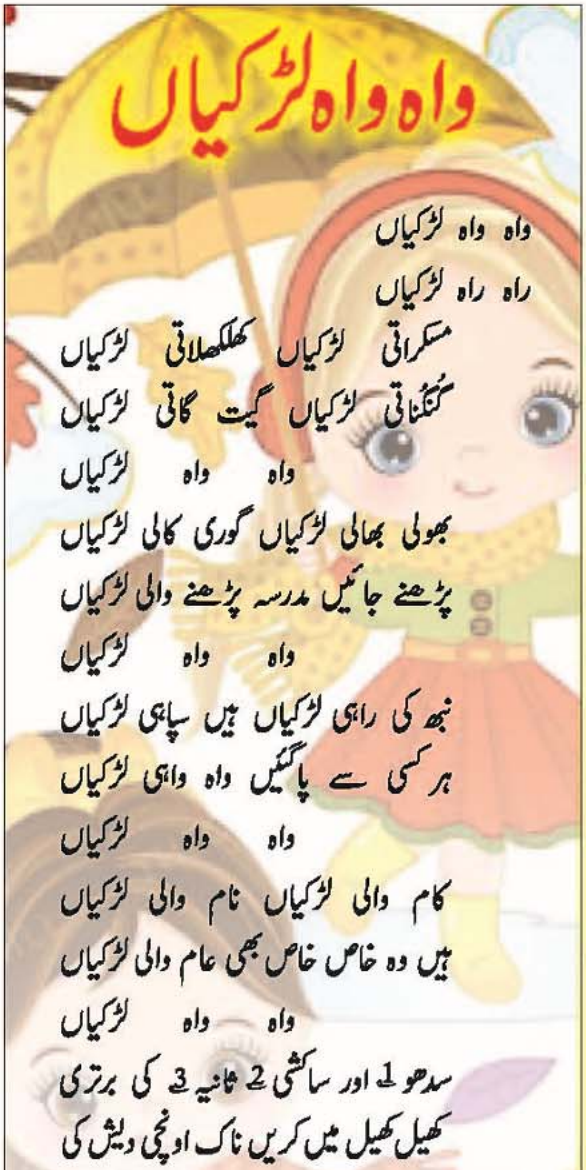

واہ واہ لڑکیاں
راہ راہ لڑکیاں
مسکراتی لڑکیاں کھلکھلاتی لڑکیاں
گنگناتی لڑکیاں گیت گاتی لڑکیاں
واہ واہ لڑکیاں
بھولی بھالی لڑکیاں گوری کالی لڑکیاں
پڑھنے جائیں مدرسہ پڑھنے والی لڑکیاں
واہ واہ لڑکیاں
نبھ کی راہی لڑکیاں ہیں سپاہی لڑکیاں
ہر کسی سے پاگئیں واہ واہی لڑکیاں
واہ واہ لڑکیاں
کام والی لڑکیاں نام والی لڑکیاں
ہیں وہ خاص خاص بھی عام والی لڑکیاں
واہ واہ لڑکیاں
سدھو[1] اور ساکشی[2] ثانیہ[3] کی برتری
کھیل کھیل میں کریں ناک اونچی دیش کی
واہ واہ لڑکیاں

1۔ بیڈمنٹن کھلاڑی 2۔ پہلوان لڑکی 3۔ ٹینس کھلاڑی

■

Hyder Bayabani
Basera Bayabani
Achalpur City - 444806 (Amt. MS)

دوسری قسط

مکھانے کی کھیر

مصنف: ذکیہ مشہدی

مصور: فجر الدین

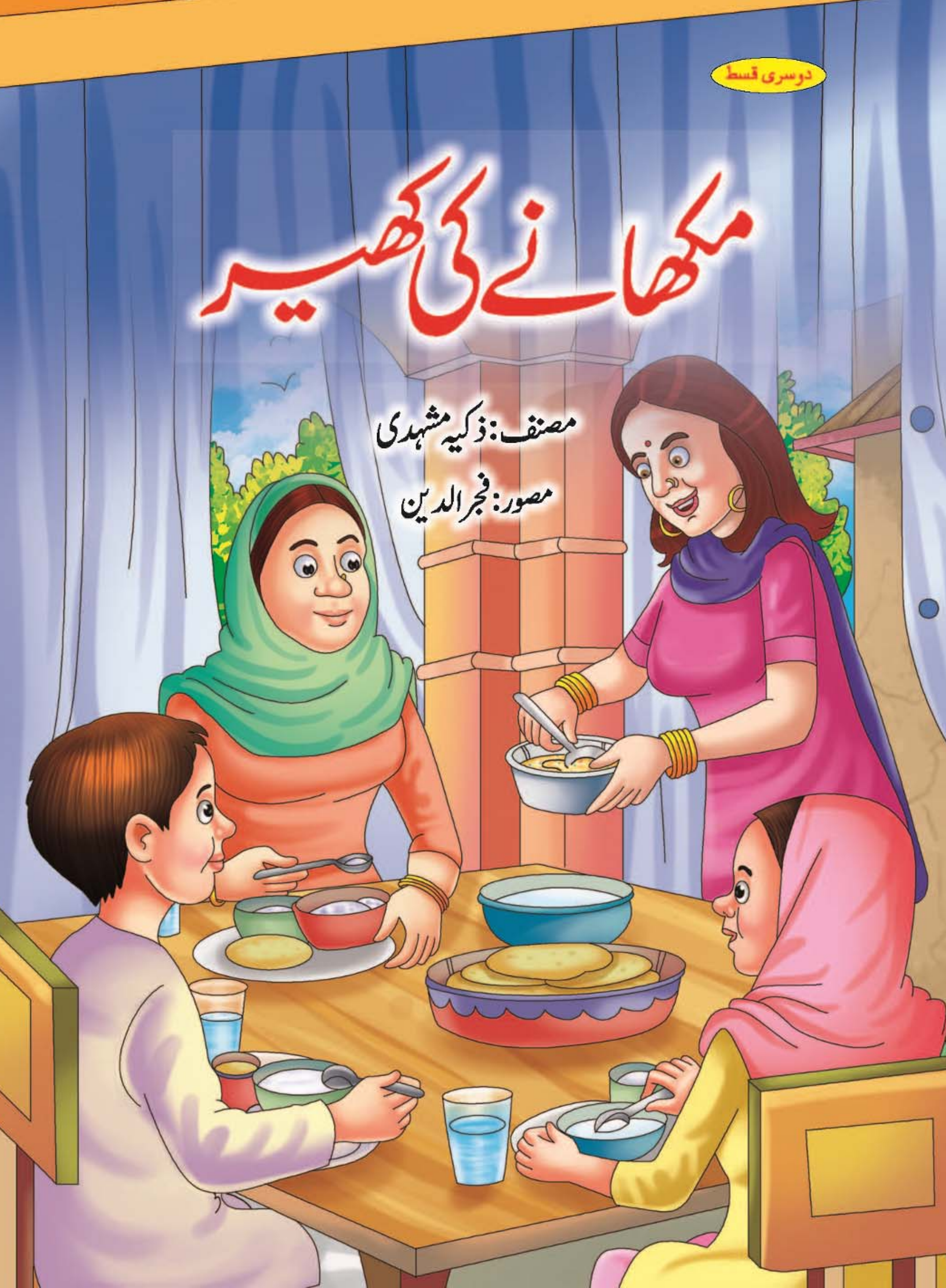

''یہ آپ لوگ کیا باتیں کرنے لگیں۔ آپ کو نہیں آتی تو راجن کی ممی سے پوچھ لیجیے۔''

''لو بھلا۔ جان نہ پہچان خالہ بی بی سلام۔ میں جاؤں ان سے کھیر کی ترکیب پوچھنے۔''

''ممی ایسا کرتے ہیں نیٹ پر دیکھ لیتے ہیں۔'' تابش کی آپی، آسیہ نے تجویز پیش کی۔

''ہرگز نہیں۔'' تابش مچل گئے۔ نیٹ پر ویسی کھیر بنانا کوئی نہیں بتائے گا جیسی راجن کی ممی بناتی ہیں۔''

''اب یہ کیا ضد ہوئی؟''

''راجن کی ممی کہتی ہیں کہ اس کی ترکیب انھیں راجن کی دادی سے ملی تھی۔ دادی کے وقت میں نیٹ نہیں تھا۔''

''تو؟''

''تو یہ کہ اصل ترکیب راجن کی دادی کو معلوم تھی۔ نیٹ پریوں ہی ہوگی۔ جھوٹ موٹ کی۔''

''ایسا کرو۔ راجن سے کہہ دو جب اس کے یہاں مکھانے کی کھیر بنے وہ تمہارے لیے ایک کٹوری لیتا آئے۔''

''ہمیں شرم آئے گی ایسا کہتے۔ پھر اگر چھٹیوں میں بنی تو''

''سر کھا گئے تم تابش۔''

''اچھا نہیں کھاتے آپ کا سر۔'' تابش وہاں سے منہ پُھلا کر چل دیے

دوسرے دن وہ ایک کاغذ کا ٹکڑا لے کر ممی کے پاس آئے۔
''اب یہ کیا ہے؟'' ممی اس وقت دھوبی کا حساب دیکھ رہی تھیں۔
''یہ مکھانے کی کھیر کی ترکیب ہوگی۔'' آسیہ نے چڑایا۔ تابش نے اسے گھور کر دیکھا
''یہ راجن کے گھر کا فون نمبر ہے۔ بلکہ اس کی ممی کے موبائل کا۔ ہم لے کر آئے ہیں راجن سے۔''

(جاری)

مصنف: جولز ورنے
مترجم: شکیل صدیقی

آٹھویں قسط

زمین کی تہہ میں

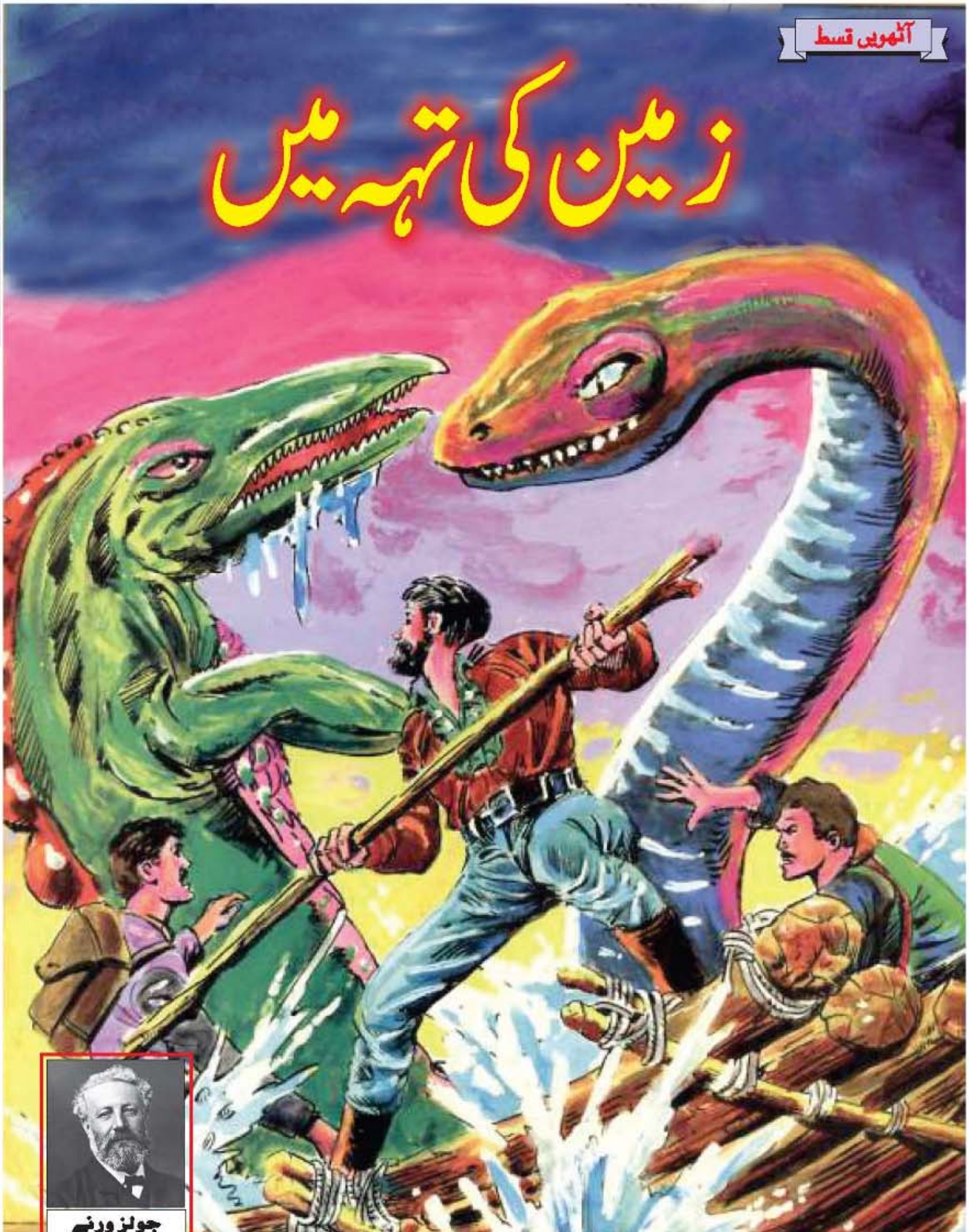

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کو نئے نئے جہانوں کی سیر کرائیں اور ثقافتی، تاریخی وتہذیبی معلومات کے ساتھ ساتھ جغرافیائی، ارضیاتی اور سائنسی معلومات بھی فراہم کریں۔ یہ ناول پہلے فرانسیسی زبان میں 1864 میں لکھا گیا تھا۔ اِس ناول کا ترجمہ اردو سمیت دنیا کی اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اِس ناول کے مصنف جولز ورنے ہیں جو عالمی ادب میں فادر آف سائنس فکشن کے طور پر مقبول ہیں۔ ان کے ایک ناول Aroundthe World in Eighty Days کو بہت زیادہ شہرت ملی تھی جس کو آپ نے 'بچوں کی دنیا' میں قسط وار پڑھا بھی ہے۔ جولز ورنے کے ناول بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی بہت مقبول رہے ہیں۔ انھیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرنے اور کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے ناولوں پر کئی فلمیں اور ٹیلی سیریل بھی بن چکے ہیں۔ 'زمین کی تہہ میں' ایک ایسا ناول ہے جس میں زمین کے ہزاروں فٹ نیچے کی دنیا کو دکھایا گیا ہے۔ یہ پروفیسر لائڈین بروک کی کہانی ہے جو ایک پراسرار تحریر کے بعد زمین کی تہہ کے ایک سفر پر نکلتا ہے جس میں اُسے ڈھیر ساری مشکلات پیش آتی ہیں۔ عجیب وغریب جانداروں اور اشیا سے اُس کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح زمین کی تہہ تک پہنچتا ہے اور واپس اِس دنیا پر آتا ہے یہی اس ناول کا ماحصل ہے۔ اس میں آپ کو سائنس کی اہم معلومات کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر کی عجیب وغریب جانکاریاں بھی ملیں گی۔

اب تک آپ نے پڑھا کہ پروفیسر لائڈین بروک معدنیات وارضیات کے ماہر تھے۔ وہ بہت قابل شخص تھے اور علاقے میں ان کی کافی عزت تھی، انھیں پرانی کتابوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ایک دن انھیں سات سو سال پرانی کتاب ہاتھ لگی جو آئس لینڈ کی زبان میں تھی۔ پروفیسر بروک اپنے بھتیجے کے ساتھ رہتے تھے۔ چچا بھتیجے نے اس کتاب کی تحریر سمجھنے کی کوشش کی۔ بہت مشکل سے بس وہ کچھ الفاظ ہی سمجھ پائے۔ پروفیسر لائیڈن بروک کہیں چلے جاتے ہیں اور ادھر بھتیجہ اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کو بتا دیتا ہے کیونکہ اس میں ایک خطرناک سفر پر جانے کی بات تھی۔ تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد پروفیسر نے سفر پر جانے کی ٹھان لی۔ بھتیجہ (البرٹ) نہیں چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گیا۔ آخر کار دو دن بعد لائیڈن بروک اور البرٹ اِس خطرناک سفر پر نکل گئے۔ سفر کے لیے انھیں کوپن ہیگن پہنچنا تھا اور وہاں سے آئس لینڈ۔ آئس لینڈ پہنچنے کے بعد ایک رات آرام کیا اور پھر دوسرے دن صبح وہاں کے مشہور آتش فشاں سینی فلز کا سفر شروع کیا۔ یعنی فلز پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑ تھا۔ کئی طوفان اور دیگر پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے چچا بھتیجے سینی فلز کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔ چوٹی سے اب آتش فشاں کے اندر اترنے کا خطرناک سفر شروع ہوا۔ دونوں لوگ سنبھل سنبھل کر زمین کی تہہ میں اترنے لگے۔ کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد دونوں تقریباً دس ہزار فٹ نیچے پہنچتے ہیں جہاں انھیں ایک عجیب وغریب منظر دکھائی دیتا ہے۔ آتش فشاں کے لاوے بکھرے پڑے تھے اور ان سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے دونوں ایک سرنگ میں داخل ہوئے اور سات گھنٹے کے سفر کے بعد وہ کھلی جگہ میں پہنچے جہاں پودوں اور جانوروں کے ڈھانچے موجود تھے۔ اب دونوں کے پاس پینے کا پانی بھی ختم ہونے والا تھا۔ سفر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ چٹانوں سے گزرتے ہوئے وہ سب ایک سرنگ میں پہنچے۔ سرنگ سے آگے انھیں کوئلے کی ایک کان ملتی ہے۔ کان میں آگے راستہ بند تھا اس لیے واپس لوٹے، جب تک پینے کا پانی ختم ہو چکا تھا۔ پانی کی کمی کی وجہ سے حالات مزید خراب ہو گئے۔ پروفیسر واپس جانے کو تیار نہیں تھے جبکہ البرٹ اور ہانس کو اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ کوئلے کی کان کے بعد تانبے اور ابرق کی کانوں سے گزرتے ہوئے دو دن اور بیت گئے۔ سارے لوگ نڈھال ہو چکے تھے۔ اس درمیان ایک دریا میں پانی بہنے کی آواز آتی ہے۔ بڑی مشکل سے چٹان توڑ کر ہانس نے پانی پینا چاہا لیکن یہ دریا گرم پانی کا تھا۔ بعد میں یہ پانی ٹھنڈا ہو گیا۔

میری گمشدگی

آگے راستہ مزید ڈھلوان ہوگیا تھا اس لیے ہم زمین کی تہہ میں اترتے چلے گئے۔ چند دن بعد ہم مرکز کی طرف تین چار میل بڑھ گئے۔ یہ راستہ بے حد خطرناک تھا، مگر ہانس کی کوشش اور رہنمائی سے ہم نے اسے طے کرلیا۔ اس خاموش شخص نے میری اور میرے چچا کی بہت سے موقعوں پر مدد کی اور ہمیں پریشانی سے بچالیا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ہمارا یہ رہنما اور خاموش ہوتا جارہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے بھی بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص جسے چار دیوار میں قید کردیا جائے رفتہ رفتہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

اس طرح سے دو ہفتے گزر گئے۔ 7 اگست کو ہم پچھتر میل نیچے پہنچ چکے تھے۔ ہمارے سروں پر اس وقت پچھتر میل چٹانیں، سمندر اور گاؤں وغیرہ تھے! ہم یقینی طور پر آئس لینڈ سے پانچ سو میل آگے جاچکے تھے۔

اس دن راستے کی ڈھلان قدرے کم تھی۔ میں سب سے آگے تھا۔ میرے اور چچا کے ہاتھ میں ایک ایک لالٹین تھی، میں اس سے گرینائٹ کی چٹانوں کا تجزیہ کررہا تھا۔

ایک بات جو میں اچانک مڑا تو میں وہاں خود کو تنہا پایا۔

''اوہ! کوئی بات نہیں۔'' میں نے سوچا۔ میں تیز چل رہا تھا اس وجہ سے یا پھر یہ کہ چچا اور ہانس کہیں ٹھہر گئے ہوں گے، میں ان سے بچھڑ گیا ہوں۔ مجھے واپس جانا چاہیے۔ خوش قسمتی سے چڑھائی آسان ہے، میں پندرہ منٹ تک واپس اس راستے پر چلتا رہا، مگر مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں نے کئی آوازیں دیں، لیکن کسی نے جواب نہیں دیا۔ میری آواز بازگشت میں دم توڑ کر رہ گئی۔

اس وقت مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔

''پرسکون رہو، گھبرانے کی بات نہیں ہے۔'' میں نے بلند آواز میں کہہ کر خود کو تسلی دی۔ راستہ ایک ہی ہے اور میں سب سے آگے تھا اس لیے بچھڑ گیا اب مجھے واپس جانا چاہیے۔

میں مزید آدھے گھنٹے تک چڑھائی چڑھتا رہا۔ کئی جگہوں پر ٹھہر کر میں نے سننے کی کوشش کی کہ شاید کوئی مجھے آواز دے رہا ہو۔ کثیف اور بند ماحول میں آواز دور تک جاتی ہے، مگر حیرت انگیز طور پر وہاں سناٹا تھا۔

مجھے یقین نہ آیا کہ میں تنہا ہوں۔ میں کہیں کھو نہیں سکتا اور اگر واقعی ایسا ہوگیا ہے تو مجھے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ جو لوگ کھوجاتے ہیں وہ کوشش کرکے اپنا راستہ دوبارہ پالیتے ہیں۔ راستہ جب کہ ایک ہی ہے اور وہ دونوں اس پر ہیں تو مجھے یقین ہے کہ اس میں انھیں تلاش کرلوں گا۔ بس مجھے مسلسل اس راستے پر چڑھتے رہنا چاہیے۔ یقیناً وہ یہ بھول گئے کہ میں سب سے آگے تھا بہرحال میں واپس پلٹ کر ان تک پہنچ سکتا تھا مگر مجھے اس کے لیے جلدی جلدی قدم اٹھانا تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ میں خود سے جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر مجھے مکمل یقین نہیں تھا۔ ہاں یاد آیا میں آگے تھا اور ہانس میرے پیچھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنے شانوں پر رکھے ہوئے سامان کو درست کرنے میں لگا تھا، یقیناً اس لمحے میں کچھ آگے بڑھ گیا تھا۔

زیر زمین بہنے والا چشمہ میرے قریب تھا۔ بس مجھے اس کے ساتھ ساتھ پیچھے جانا تھا، پھر اپنے ساتھیوں سے میری ملاقات ہوجائے گی۔

اس خیال سے مجھے تسلی ہوئی کہ میرے چچا دانش مند ہیں اور انھوں نے ہانس کو پانی تلاش کرنے کے لیے دیواروں میں

سوراخ نہیں کرنے دیا اور ہفتوں تک ہمیں پانی مہیا کرتے رہے۔ اب وہی چشمہ میری رہنمائی کرے گا۔ راستے پر چڑھائی سے پہلے میں جھک کر چشمے سے منہ ہاتھ دھونا چاہتا تھا۔

اس وقت میں سہم گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ میں خشک اور کھردرے گرینائٹ پر کھڑا ہوں، اور وہ چشمہ میرے قریب نہیں بہہ رہا ہے۔

اس لمحے مجھ پر جو مایوسی طاری ہوئی میں اسے بیان نہیں کرسکتا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ جیسے مجھے زندہ دفن کردیا گیا ہو اور میں یہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر جان دے دوں گا۔

میں نے گرینائٹ کی چٹانوں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ بہت سخت اور خشک محسوس ہوئیں!

اس وقت مجھ پر منکشف ہوا کہ جب میں نے اپنے ساتھیوں کی آوازیں سننے کی کوشش کی تھی تو مجھے سناٹا اور سکوت کیوں محسوس ہوا تھا، مگر وہ چشمہ میں نے کیسے کھودیا؟ اس کا مطلب یہ کہ وہ راستہ دو حصوں میں تقسیم تھا، میں ایک راستے پر چلا گیا جب کہ میرے ساتھی اور وہ چشمہ دوسرے راستے پر تھے۔ میں گم ہوگیا تھا۔ ساڑھے سات سو میل چٹانی سلسلے کے نیچے گم ہوگیا تھا۔

میں ان چیزوں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرنے لگا جو میں زمین پر چھوڑ آیا تھا۔ ہمبرگ، کنگس اسٹریٹ کے مکان، چچا کے ساتھ اور آئس لینڈ تک سفر۔ مجھے مسٹر فریڈ اور سینی فلز کا بھی خیال آرہا تھا، مگر کیا کوئی ایسی طاقت بھی تھی جو ان چٹانوں میں راستہ پیدا کر کے مجھے نکال لے! یا کم از کم مجھے میرے ساتھیوں تک پہنچادے؟

''اوہ چچا جان۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

میں نے سوچا کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں۔ بچپن کی یادیں میرے ذہن میں آنے لگیں اور میں دوزانو ہوکر دعا کرنے لگا۔

اس طرح مجھے قدرے سکون پہنچا اور میں صورت حال کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے قابل ہوسکا۔

میری پانی کی بوتل بھری ہوئی تھی اور کھانا اتنا تھا کہ تین

دن تک چل سکے۔ اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں اوپر جاؤں یا نیچے؟ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اوپر جانا چاہیے، کم ازکم اس مقام تک جہاں کے میں نے چشمے کو چھوڑا تھا۔ پھر جب چشمہ میرے قدموں میں ہوگا تو پھر میں اس کے سہارے سینی فلز کی چوٹی تک پہنچ سکوں گا۔

یہ بات میں نے پہلے کیوں نہیں سوچی تھی؟ اس طرح سے میری جان بچ سکتی تھی۔ مجھے لازماً اس چشمے کو دوبارہ تلاش کرنا تھا!

میں اپنی فولادی چھڑی پر زور دے کر پھر چلنے لگا۔

میرے قدم اس راستے کے نشیب وفراز سے مانوس تھے اور میں جانتا تھا کہ کہاں سیدھا جانا ہے اور کب مڑنا ہے مگر اس وقت مجھے راستہ نامانوس محسوس ہوا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ راستہ ختم ہوگیا اور میں دھماکے سے ایک ٹھوس چٹان سے ٹکرا کر گر گیا۔

خوف اور مایوسی سے میں وہاں ساکت پڑا رہا، میری آخری امید بھی اب ختم ہوچکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اب کبھی یہاں سے نہیں نکل سکوں گا اور مجھے ایک خوف ناک موت آجائے گی۔ میں نے تھوڑی دیر بعد آوازیں دینا شروع کردیں، لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ فضا میں کثافت بڑھ گئی تھی اور میں بمشکل سانس لے پا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں ایک نئے خوف کا شکار ہوگیا۔ جب میں چٹان سے ٹکرا کر گرا تھا تو میری لالٹین ٹوٹ گئی تھی، اب اس کی روشنی رفتہ رفتہ کم ہورہی تھی اور ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ بجھنے والی ہو۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں بند کرلوں۔ وہ روشنی ختم ہورہی تھی..... ختم ہورہی تھی..... بالآخر وہ ختم ہوگئی اور مکمل تاریکی چھا گئی۔

میرے ہونٹوں سے ایک لرزہ خیز چیخ نکلی۔ اس گھٹاٹوپ تاریکی میں مجھے ایسا لگا جیسے میں اندھا ہوگیا ہوں۔ میں کھڑا ہوگیا اور میں نے اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلا دیے تاکہ میں کسی چیز سے ٹکرا نہ جاؤں۔ راستہ ڈھلوان تھا اور میں مسلسل نیچے ہی نیچے جارہا تھا، میں چیخ رہا تھا، رورہا تھا، تیز نوکیلی چٹانوں سے رگڑ کھا کر زخمی ہورہا تھا اور اپنے چہرے سے ٹپکنے والے خون کو صاف کرتا جارہا تھا۔ میں بھاگ رہا تھا مگر مجھے قطعی معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جارہا ہوں۔ پھر میں زمین پر گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔

جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے اپنا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا پایا۔ میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ معلوم کرسکوں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا۔ مجھ سے زیادہ اس وقت دنیا میں کوئی تنہا نہیں ہوگا۔

میرا جسم زخموں سے چور تھا اور جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ میں اس بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ میری تکلیف اتنی شدید تھی کہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں مرجاتا تو بہتر ہوتا۔ میں لڑھک کر دوسری چٹانی دیوار کی طرف چلا گیا۔

تب مجھے ایک بلند اور خوف ناک گڑگڑاہٹ سنائی دی جو رفتہ رفتہ معدوم ہوگئی۔ وہ کہاں سے آئی تھی؟ غالباً کوئی زیرزمین دھماکا ہوا تھا۔

میں کان لگا کر سننے لگا کہ ممکن ہے کہ ایسی گڑگڑاہٹ دوبارہ ہو، مگر پندرہ بیس منٹ یونہی خاموشی میں گزر گئے۔

میرے کان چونکہ دیوار سے لگے ہوئے تھے چنانچہ مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ وہ کافی دور سے آرہی تھیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی باتیں کررہا ہو۔

''یہ میرا وہم ہے۔'' میں نے مضطرب ہوکر سوچا۔

مگر نہیں۔ دوبارہ کان لگانے پر مجھے پھر باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ مجھ پر اتنی نقاہت طاری تھی کہ میں اس گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ بہر حال مجھے اس کا یقین تھا کہ کوئی بول رہا ہے۔

ایک لمحے کے لیے میں خوف زدہ ہوگئی کہ شاید وہ میری ہی خود کلامی تھی جو بازگشت پیدا کر کے میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ غالباً لاعلمی میں، میں دیر تک چیختا رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے اور اپنے کان دوبارہ دیوار سے لگا دیے۔

''ہاں۔ کوئی باتیں کر رہا ہے۔''

میں گھسٹتا ہوا چند فیٹ مزید دیوار کے قریب گیا تو مجھے واضح آوازیں سنائی دیں، اور کسی نے افسردہ لہجے میں کہا وہ گم ہو گیا، کون بول رہا تھا یقیناً وہ میرے چچا تھے یا ہانس اگر مجھے ان کی آواز سنائی دے رہی تھی تو لازماً انھیں میری آواز بھی سنائی دے گی۔

''مدد!'' میں پوری قوت سے چیخا۔ ''مدد۔''

میں جواب کا انتظار کرتا رہا، مگر تاریکی سے کوئی جواب، چیخ یا کسی کے سانس لینے تک کی آواز نہیں آئی۔ غالباً میری آواز نحیف تھی اور میرے ساتھیوں کے کانوں تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔

''وہی لوگ ہوں گے۔'' میں نے خود سے کہا۔ ''اور ان کے علاوہ پچھتر میل زمین کے نیچے کون آ سکتا تھا؟''

میں نے ایک بار پھر دیوار سے کان لگائے۔ ایک مقام پر مجھے وہ آوازیں بہت واضح اور بلند سنائی دیں۔ ''گم ہو گیا۔'' کسی نے کہا اور اس کے بعد وہی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ پھر میں نے اپنا نام سنا۔ وہ میرے چچا تھے اور گائڈ سے باتیں کر رہے تھے۔

اچانک میں ساری بات سمجھ گیا۔ وہ آوازیں دیوار کی دوسری طرف سے نہیں آ رہی تھیں، آ بھی نہیں سکتی تھیں اس لیے کہ وہ گرینائٹ کی ٹھوس دیواریں تھیں۔ وہ آوازیں دیواروں کے ساتھ ساتھ اور ان سے لگ کر آ رہی تھیں۔

اب مجھے جلدی کرنا تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے چچا دیوار سے دور چلے جائیں۔ میں نے اپنا چہرہ دیوار سے ٹکایا اور واضح الفاظ میں کہا ''چچا بروک!''

چند سیکنڈ گزر گئے جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ پھر یہ الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے:

''البرٹ، البرٹ کیا یہ تم ہو؟''

''ہاں ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم کہاں ہو؟''

''میں تاریکی میں گم ہو گیا ہوں۔''

''تمھاری لالٹین کیا ہوئی؟'' انھوں نے پوچھا۔

''وہ بھی گم ہو گئی۔''

''اور چشمہ؟''

''وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔''

''البرٹ!'' میرے بچے باتیں کرتے رہو۔

''میں بہت تھک گیا ہوں، آپ باتیں کیجیے۔''

''حوصلہ رکھو۔'' میرے چچا نے کہا ''ہم لوگ اس راستے پر چڑھ اور اتر رہے تھے مگر ہمیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے بچے! میں نے تمھاری یاد میں آنسو بہائے ہیں۔ آخر کار ہم چشمے کے ساتھ ساتھ نشیب میں چلے گئے ور پھر ہم نے اپنی بندوقوں سے فائرنگ کی۔ ہم ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے۔ البرٹ، مایوس نہ ہو ہم کم از کم ایک دوسرے کی آوازیں تو سن سکتے ہیں نا؟''

ان کے حوصلہ دلانے پر میرے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن روشن ہوئی۔ ''چچا جان!'' میں نے دیوار سے ہونٹ

لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں میرے بچے۔'' چند سیکنڈ بعد ان کی آواز آئی۔

''ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ آپ کے پاس کرونو میٹر ہے؟''

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر آپ میرا نام لیجیے اور وقت نوٹ کر لیجیے۔ مجھے جیسے ہی آپ کی آواز سنائی دے گی میں اپنا نام دہراؤں پھر آپ یہ دیکھیے گا کہ میری آواز آپ تک کتنی دیر میں واپس آئی۔''

''ٹھیک ہے کیا تم تیار ہو۔''

''ہاں۔''

''میں تمھارا نام پکارتا ہوں۔''

مجھے جیسے ہی ''البرٹ'' سنائی دیا میں نے دہرایا۔ ''البرٹ!'' پھر انتظار کرنے لگا۔

''چالیس سیکنڈ۔'' میرے چچا نے کہا ''میں نے البرٹ کہا اور تم نے اس کا جواب دیا تو یہ سب چالیس سیکنڈ میں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آواز نے ایک طرف کا فاصلہ بیس سیکنڈ میں طے کیا۔ آواز ایک سیکنڈ میں 1020 فیٹ کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس طرح سے 20400 فیٹ بنے یا تقریباً چار میل۔

''چار میل!'' میں بڑبڑایا۔ ''مجھے اوپر جانا چاہیے۔''

''نیچے اور میں تمھیں بتاتا ہوں کہ کیوں۔ ہم ایک بہت بڑے غار میں ہیں اور اس تک بہت سے راستے جاتے ہیں۔ تم جس راستے پر ہو وہ یقیناً یہاں تک آئے گا کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تمام دراریں اور راستے یہاں سے شروع ہوتے ہوں۔ اب اٹھو اور چل پڑو۔ جب تم ڈھلان طے کرلو گے تو تم ہمیں اپنے بازو پھیلائے اپنا استقبال کرتے دیکھو گے۔ آؤ، میرے بچے آؤ۔''

ان کے جملوں سے میرا حوصلہ بڑھا۔

''چچا جان میں آرہا ہوں۔'' میں چلایا۔ یہاں سے ہٹنے کے بعد میں آپ سے بات نہیں کر سکتا۔ اس لیے اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ البرٹ، اللہ حافظ۔''

یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے۔ ہماری یہ حیرت انگیز گفتگو چار میل کے فاصلے سے ہوتی رہی اور ان پرامید لفظوں پر ختم ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر چچا کی آواز مجھ تک آرہی تھی تو درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اگر میں آواز کے اس راستے پر چلتا رہا اور میری ٹانگوں کی توانائی نے اجازت دی تو میں ان تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔ میں اٹھ گیا اور میں نے خود کو اس راستے پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ راستہ ڈھلوان تھا اور میں اس پر پھسل رہا تھا۔ میری رفتار کافی تیز تھی۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں خود کو روک سکوں۔ پھر میں پھسلتا ہی چلا گیا۔ بالکل عمودی، زمین میرے قدموں تلے سے غائب ہوگئی۔ کافی نیچے جا کر میں زمین پر گرا تو میرا سر ایک چٹان سے ٹکرا گیا اور میں بے ہوش ہوگیا۔

جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے خود کو نیم تاریکی میں ایک کمبل پر پڑے پایا۔ پہلی نظر چچا جان پر پڑی جنھوں نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ میری آنکھیں کھلتے دیکھ کر وہ خوشی سے چلائے۔

''یہ زندہ ہے! زندہ ہے۔!''

''ہاں۔'' میں نے کمزور آواز میں کہا۔

''میرے پیارے بچے۔'' چچا جان نے مجھے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''تم بچ گئے ہو۔'' ان کے جملوں اور حرکتوں سے مجھے خوشی ہوئی۔ پروفیسر کی طرف سے ایسی محبت

اور شفقت بہت کم دیکھنے کو ملتی تھی۔

پھر ہانس ہمارے قریب آیا، اس نے جب چچا کو میرا ہاتھ تھامے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھی خوشی سے جگمگانے لگیں۔

”نیا دن مبارک ہو!“ وہ بولا۔

”نیا دن مبارک ہو ہانس۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔

”چچا جان یہ بتائیے کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔“

”کل بتاؤں گا البرٹ۔“ وہ بولے۔ ”آج تم بہت کمزور ہو۔“

”مگر کم از کم یہ تو بتا دیجیے وقت کیا ہوا ہے اور آج دن کون سا ہے۔“

”آج نو اگست، اتوار ہے اور رات کے گیارہ بجے ہیں۔ اب میں تمھارے باقی سوالوں کے جوابات دس تاریخ کو دوں گا۔“

اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں تین دن تک تنہا ان راستوں پر بھٹکتا رہا تھا! میں یقیناً بہت کمزور تھا اس لیے ان کے بارے میں سوچتے ہوئے سو جانا چاہتا تھا۔

دوسری صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرا بستر ان سب کمبلوں میں سے نا تھا جو ہمارے استعمال میں تھے۔ وہ ایک آرام دہ غار کی طرح سے تھا اور فرش ریتیلا تھا۔ کوئی لالٹین روشن نہیں تھی، مگر ایک سوراخ سے روشنی چھن کر آرہی تھی۔ مجھے ایسی پراسرار آوازیں سنائی دیں جیسے لہریں ساحل سے ٹکراتی ہیں، پھر ہوا چلنے کی سرسراہٹ سنائی دی۔

کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟ یا بلندی سے گرنے پر میرا سر پھٹ گیا تھا؟

”نہیں، یہ واقعی دن کی روشنی ہے، میں نے سوچا جو چٹانوں سے چھن کر آرہی ہے اور یہ حقیقت میں لہروں کی آواز ہے۔ ہوا بھی سیٹیاں بجاتی ہوئی چل رہی ہے۔ تو کیا ہم سطح تک واپس پہنچ گئے ہیں؟ میرے چچا نے یہ مہم ترک کر دی ہے یا پھر وہ اسے کامیابی سے سر کر چکے ہیں؟

پروفیسر دکھائی دیے۔

”صبح بخیر البرٹ!“ انھوں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ ”ہانس اور میں ساری رات تمھاری نگرانی کرتے رہے ہیں۔ تم گہری نیند سوئے اس لیے اب بہتر محسوس کر رہے ہو گے۔“

”یقیناً محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا ”اور یہ میں اپنے کھانے کی رفتار سے ثابت کروں گا جو آپ ناشتے کے طور پر

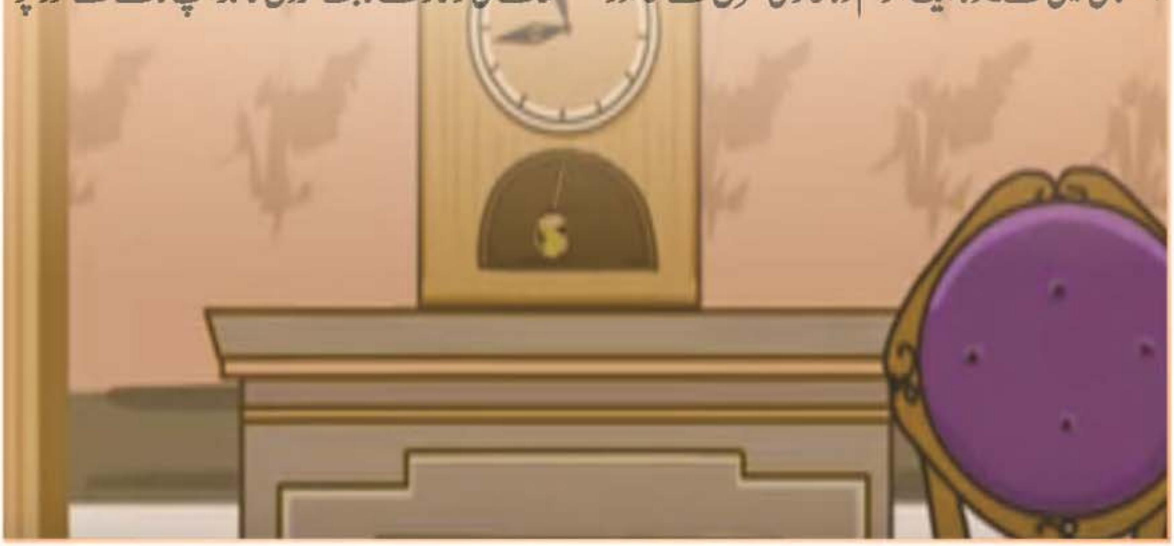

مجھے دیں گے۔"

"اوہ! تمھیں کھانے کو کچھ ملنا چاہیے میرے بچے۔ تمھارا بخار اتر چکا ہے، ہانس کا شکریہ کہ تمھارے زخم تیزی سے بھر رہے ہیں۔"

چچا نے میرے لیے کھانا تیار کیا۔ میں نے رغبت سے کھانا شروع کیا پھر انھوں نے میرے سوالوں کے جوابات دینے شروع کر دیے۔ مجھے معلوم ہوا کہ جب میں بلندی سے نیچے گرا تھا تو سیدھا چچا جان کے بازوؤں میں آ گیا تھا۔

"یہ حیرت انگیز بات ہے کہ تم ہلاک نہیں ہوئے۔ اب ہم سے علاحدہ نہیں ہونا ورنہ پھر ہم سے کبھی نہ مل سکو گے۔" انھوں نے کہا۔

پھر کبھی؟ میں چونکا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی!

"کیا بات ہے البرٹ؟" انھوں نے فوراً پوچھا۔

"میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے کہا تھا کہ میں ٹھیک ہو چکا ہوں۔"

"ہاں۔"

"اور میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی ہے۔"

"ایک بھی نہیں۔"

"اور میرا سر؟"

"تمھارا سر سلامت ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میرا دماغ صحیح نہیں ہے۔"

"تمھارا دماغ؟" وہ چونکے۔

"ہاں۔ ہم سطح پر تو نہیں پہنچے ہیں، یا پہنچ چکے ہیں؟"

"نہیں یقیناً نہیں۔"

"پھر لازماً میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے سورج کی روشنی نظر آ رہی ہے اور مجھے سمندر کی آواز اور ہوا کا شور سنائی دے رہا ہے۔"

"اوہ، بس یہی الجھن ہے؟"

"کیا آپ اس کی وضاحت نہیں کریں گے؟"

"میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا، تم یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

"تو پھر باہر چلنا چاہیے۔" میں چلایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"نہیں البرٹ، کھلی ہوا ممکن ہے تمھیں نقصان پہنچا دے۔"

"کھلی ہوا؟" میں نے تعجب سے دہرایا۔

"ہاں۔ ہوا کچھ بھاری ہے۔"

"لیکن میں خود کو بالکل صحیح محسوس کر رہا ہوں۔"

"میرے بچے ذرا صبر کرو۔ ہمارا سمندری سفر قدرے طویل ہو سکتا ہے۔"

"سمندری سفر؟" میں نے چونک کر دہرایا۔

"ہاں۔ آج اور کل آرام کر لو۔ پھر ہم بحری سفر شروع کریں گے۔"

"بحری سفر؟" میں نے کہا۔ کیا یہاں کوئی جھیل یا دریا وغیرہ تھا؟ کیا کوئی بحری جہاز کسی زمین دوز بندرگاہ پر لنگر انداز ہمارا انتظار کر رہا تھا؟ میرا تجسس اتنا بڑھا ہوا تھا کہ میرے چچا نے مجھے اس کے بارے میں بتانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے جلدی سے لباس پہنا، ایک کمبل اپنے جسم پر لپیٹا اور غار سے باہر آ گیا۔

■

(جاری)

ماخذ: زمین کی تہہ میں (جولز ورنے کے ناول کا ترجمہ)، مترجم: شکیل صدیقی، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشتراک: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

رابعہ خاتون علوی

مجاہد آزادی حاجی بیگم

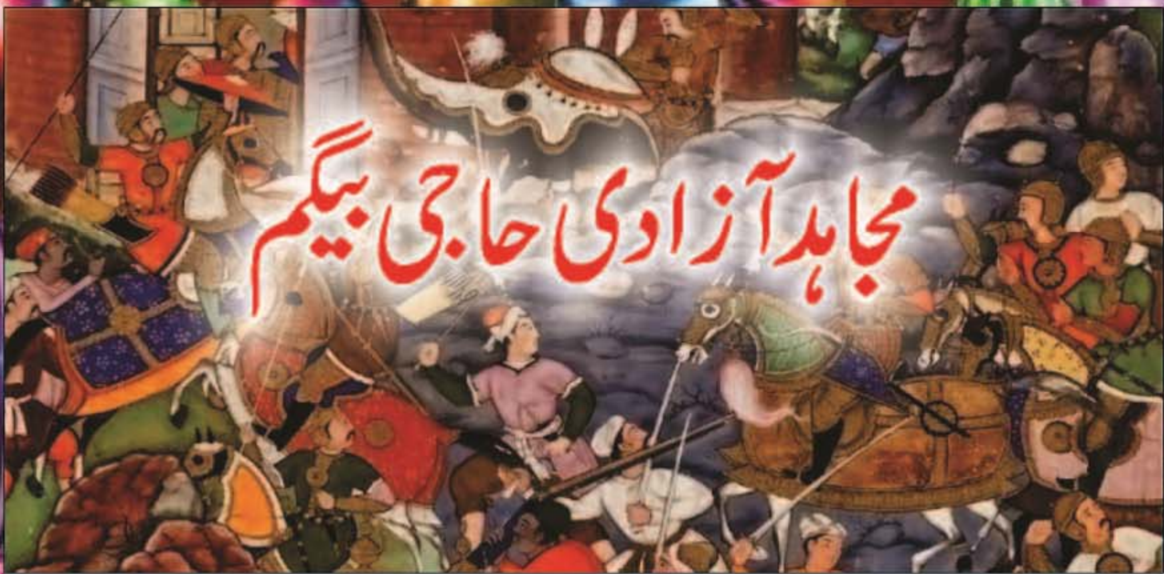

ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں سہسرام کی حاجی بیگم کا نام سنہرے لفظوں میں درج ہے۔ ریاست بہار کی وہ پہلی خاتون تھیں، جنھیں 1857 کے انقلاب میں 'جھانسی کی رانی' کے بعد دوسرا مقام حاصل ہوا۔ حاجی بیگم کے خاندان کے رکن ڈاکٹر ایم۔اے۔قدیر خان مرحوم، پٹھان ٹولی، سہسرام کے ذریعے شائع رسالہ 'نیا دور' اگست 1990 کے مطابق 1540 سے 1545 کے درمیان فریدالدین خاں شیر شاہ سوری کے دورِ حکومت میں بہت سے افغانی اپنے ملک اللیز افغانستان کو چھوڑ کر دہلی سے ہوتے ہوئے شیر شاہ کی نگری سہسرام میں پورے کنبہ کے ساتھ آباد ہوگئے اور انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا۔ افغانستان سے آنے والوں میں بہت سے صوفی، سنت اور بہت سے مشہور و معروف قبیلے جیسے کھٹک، بنگس، آفریدی، یوسف زئی، وغیرہ شامل تھے۔ پٹھان ٹولی، سہسرام کے محمد قدیر (مرحوم) کہتے تھے کہ ''ہمارا خاندان افغانستان سے شیر شاہ سوری کے دورِ حکومت میں غازی پور آیا، پھر جلد ہی وہاں سے منتقل ہوکر سہسرام آیا اور محلّہ افغان ٹولی میں رہنے لگا جو آج پٹھان ٹولی ہے۔ قصبۂ جمانیہ غازی پور میں آج بھی ایک محلّہ کھٹک ٹولی کے نام سے مشہور ہے۔''

درج بالا قبیلوں میں بنگس قبیلے کے سردار صدیوں قبل بودی خان بنگس نام کے ایک شخص تھے۔ ان کی اولاد میں مبارک خاں، سیف اللہ خاں، قدرت اللہ خاں بنگش ہی مشہور شخصیت کے مالک تھے۔ آج بھی ان لوگوں کے نام پر سیف اللہ گنج، مبارک گنج نامی محلے سہسرام میں مشہور ہیں۔

قدرت اللہ خاں کی اولاد میں دو لڑکے جماعت اللہ خاں، سرفراز خاں اور ایک لڑکی مسماۃ حاجی بیگم تھیں، جن کی پیدائش 1781 میں ہوئی تھی۔ حاجی بیگم صاحبہ اپنے تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ تیز اور عقلمند تھیں۔ ان کی شادی چھپرہ ضلع (بہار) کے ایک اعلیٰ خاندان میں ہوئی، لیکن چند ہی سال میں بیوہ ہوگئیں، ان کے شوہر کا نام شہریار خاں تھا۔ مبارک خاں بنگش کے پاس ایک چھوٹی سی جاگیر تھی، جس میں باون مواضع تھے۔ وراثتاً یہ قدرت اللہ خاں کو ملے۔ جب موصوفہ بیوگی کے عالم میں اپنے آبا و اجداد کے گھر آئیں، تو

والد محترم قدرت اللہ خاں کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ دیگر بھائی چھوٹے تھے۔ اتنی بڑی جاگیر کا بندوبست اس عظیم ہستی نے اپنے سر لیا۔ اپنی جاگیر کا کام نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہی تھیں کہ اچانک 1857 کی پہلی جنگ آزادی شروع ہوگئی۔

حاجی بیگم نے عورت ہوتے ہوئے بھی بڑی بہادری سے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنی ہستی کا لوہا منوایا۔

سہسرام میں جب 1857 کی جنگ آزادی کا آغاز ہوا، اس وقت بیکر نام کا انگریز سہسرام میں مجسٹریٹ تھا۔ انگریزوں کی دو رجمنٹ فورس یہاں موجود تھی، جو مجاہدین آزادی کو کچل کر دہشت پھیلا رہی تھی۔ اسی وقت آرہ سے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کی لڑائی کی قیادت کرتے ہوئے امر سنگھ اور کنور سنگھ سہسرام پہنچے۔ حاجی بیگم کے محل میں آرام کیا، حاجی بیگم نے بابو ویر کنور سنگھ اور امر سنگھ کا پرجوش استقبال کیا۔ انھیں عزت کے ساتھ اپنے محل کے مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے کا وعدہ حاجی بیگم نے کیا اور اپنے بھائی ویر کنور سنگھ کو راکھی باندھ کر ان کی درازیٔ عمر کے لیے دعا کی، ان کا حوصلہ بڑھایا۔ اسی وقت کچھ غداروں نے بابو ویر کنور سنگھ کے ٹھہرنے کی بات انگریز مجسٹریٹ سے کردی۔ دو رجمنٹ فورس لے کر مجسٹریٹ نے حاجی بیگم کے محل پر حملہ کر دیا۔ حاجی بیگم ڈولی میں بیٹھ برقعہ پہن کر ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر انگریز فورس پر ٹوٹ پڑیں۔ سہسرام کے ان سبھی باشندوں کو للکارا اور کہا کہ کیا تم لوگوں نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں؟ مادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی پرواہ مت کرو، انگریز سپاہیوں سے مقابلہ کرو۔ ان کے جوش دلانے پر یہاں کے لوگوں نے آزادی کے لیے انگریز فورس سے مقابلہ کیا۔ انگریز فوج کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ حاجی بیگم نے جب انگریزوں کے دانت کھٹے کردیئے، دوسری مرتبہ سترہویں رجمنٹ نے پھر حاجی بیگم اور ویر کنور سنگھ پر حملہ کردیا، گھمسان جنگ ہوئی۔ انگریز سپاہیوں کو حاجی بیگم اور ویر کنور سنگھ نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ویر کنور سنگھ پہاڑ کے راستے مرزاپور کی طرف آزادی کی لڑائی کا پیغام لیے چلے گئے۔ حاجی بیگم کے محل کو انگریزوں نے تہس نہس کر کے بارود سے اڑا دیا۔ اس کا کچھ حصہ کھنڈر ہوگیا، کچھ بچا رہا۔ حاجی بیگم خرم آباد چلی گئیں۔ انھوں نے آزادی کی لڑائی میں ہمیشہ اپنا تعاون بہادری کے ساتھ دیا۔ ہندو-مسلم-سکھ- عیسائی سبھی کو اپنا بھائی سمجھتی رہیں۔ ان کا انتقال یکم جنوری 1859 کو ہوا۔ ان کا مزار افغان ٹولی اب پٹھان ٹولی محلے میں ہے۔

حاجی بیگم کے متعلق ڈسٹرکٹ ایجوکیشن کمیٹی کے ذریعے تشکیل ایجوکیشن کمیٹی کی کتاب 'نیا سویرا' میں حاجی بیگم کا نام اور کارنامے شائع ہوئے ہیں اور بہار اسٹیٹ بک کمیٹی کے ذریعے شائع بہار ایجوکیشن کونسل کے ذریعے اردو کی چوتھے درجے کی کتاب میں حاجی بیگم سے متعلق مضمون دیکھنے کو ملتا ہے۔ حاجی بیگم کے متعلق الک منڈوم کے ذریعے لکھی گئی تحریر پڑھنے لائق ہے:

"A gem of Indian history by Alak Madup, "No one know today the heroic struggle of Haji Begum of Sasaram against The British Forces. It the history is written today she will turned out to be another Rani of Jhansi. (Dated 10.11.72 page 5 Indian Nation, Patna)"

■

Rabia Khatoon
Alavi House, Chokhandi
Sahsaram (Bihar)

سمیہ خانم نور خان

اچھی باتیں

* دوسروں میں عیب نکالنے والا سب سے بڑا عیب دار ہوتا ہے۔
* بہترین انسان وہ ہے جو اپنی برائیاں تلاش کرے۔
* مظلوم کی بددعا سے دور رہنا چاہیے کیونکہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔
* انسان خودغرض ہو جائے تو اچھے برے کی تمیز بھلا بیٹھتا ہے۔
* زیادہ بولنے والا انسان بے وقوف ہوتا ہے
* غرور عقل کے لیے آفت ہے
* ادب لوگوں کی ڈھال ہے۔
* جہالت زندوں کی موت ہے۔
* جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے، خدا اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔
* دوسروں کے مال کی لالچ نہ کرنا بھی سخاوت ہے۔
* تمھاری عقل ہی تمھاری استاد ہے۔
* کوئی خوبی انسان سے زیادہ عظیم نہیں۔
* حالات انسان کو نہیں انسان حالات کو سنوارتے ہیں۔
* اس غریبی سے پناہ مانگو جو مایوس کر دیتی ہے، اور اس مال سے پناہ مانگو جو گھمنڈ پیدا کر دیتا ہے۔
* خود کو اخلاقی طور پر سنوارنے میں اتنا وقت صرف کرو کہ تمھیں دوسروں پر تنقید کرنے کی فرصت نہ ملے۔

اقوال حضرت علی

* جو بہت اچھا لگے اس سے بہت کم ملا کرو۔
* جو انتہا سے زیادہ اچھا لگے اسے صرف دیکھا کرو۔
* اور جو دل میں سما جائے اسے صرف یاد کیا کرو۔ کیونکہ.... جو جس کے جتنا قریب ہوتا ہے دنیا اسے اتنا ہی دور کر دیتی ہے۔

■

Sumayya Khanum Noor Khan
RH No- 30, B No-03, Labour Colony
ITI Road Nanded - 431602 (Maharashtra)

سیدہ مظہر سلطانہ

مزاحیہ پیغام

یہ دنیا

دنیا صرف ایک جلی ہوئی ہانڈی ہی نہیں بلکہ اس میں مٹر کے دانوں کی طرح خلوص کے موتی بھی بکھرے ہوئے ہیں۔
ٹماٹر کی طرح سرخ پھول شلجم کی طرح بنفشی کلیاں اور پودینہ دھنیے کی طرح ہری بھری گھاس بھی ہے۔ یہاں گاجر کی طرح میٹھے دوست بھی ہیں اور کڑوے کریلوں کی طرح دشمن بھی ہیں لیکن انسان کو اس میں پالک کی طرح رہنا پڑتا ہے۔ دنیا ایک پیاز ہے۔ اس میں آنسوؤں کی طرح لڑیاں، کچی کیریوں کی طرح خوشبو ہے۔ اس لیے
ہمیں آپس میں ہمیشہ سلاد کی طرح مل جل کر رہنا چاہیے۔

زندگی کی گاڑی چلانے کے اصول

اگر زندگی کی گاڑی کو کامیابی سے چلانا چاہتے ہو تو دل کے ایکسی لیٹر Exceleter پر ہمیشہ قابو رکھو۔ دماغ کے بریک کو صاف اور آرڈر میں رکھو۔ غصے کی اسپیڈ کو کنٹرول میں رکھو۔ سخاوت کی راہ آتے ہی ٹاپ گیئر کا استعمال کرو۔ برائی کی راہ آتے ہی ریورس گیر کا استعمال کرو۔ اپنی گاڑی میں ہمیشہ اچھے ظرف اور اخلاق کے ٹائر استعمال کرو۔ اپنی ذہنیت کو برے خیالات کے پنکچر سے بچاؤ۔ اپنی دل و دماغ کی ڈگی کو وسیع رکھو۔ زبان کی میز ریڈنگ پر ہمیشہ نظر رکھو۔ مسکراہٹ کے سائرن کا ہمیشہ استعمال کرو۔ بداخلاقی کی پالیسی سے بچنے کے لیے اپنے پاس ہمیشہ شرافت کا لائسنس ساتھ رکھو۔

■

Syeda Mazher Sultana
Assit. Teacher, Fatima Girls Urdu High School, Begum Pura, Aurangabad (M)

آؤ اردو سیکھیں

بچو!اس شمارہ میں پانچ حروف کو جانیے اور سیکھیے۔

बच्चो! इस शुमारे में पाँच हुरूफ़ को जानिए और सीखिए–

ژ	ز	ڑھ	ڑ	ر
(बड़ी ज़े)	(ज़े)	(ढ़े)	(ड़े)	(र)

(बड़ी ज़े)	(ज़े)	(ढ़े)	(ड़े)	(र)
ژ	ز	ڑھ	ڑ	ر

ان پانچ میں سے دو حروف 'ڑ' اور 'ڑھ' کسی لفظ کے شروع میں نہیں آتے۔ ر، ڑ، ز اور ژ بھی اپنے بعد آنے والے حرف سے نہیں جڑتے۔

इन पाँच में से दो हरूफ़ 'ड़े' (ڑ) और 'ढ़े' (ڑھ) किसी लफ़्ज़ के शुरू में नहीं आते। र (ر), ड़े (ڑ), ज़े(ز) और बड़ी ज़े (ژ) भी अपने बाद आने वाले हर्फ़ से नहीं जुड़ते।

ر سے رتھ، رکشا، رحل، روٹی، راکھی

रे (ر)से रथ, रिक्शा, रहल, रोटी, राखी

ز سے زنجیر، زبور، زُنّار، زاغ؛ زبان

ज़े (ز) से ज़ंजीर, ज़बूर, ज़ुन्नार, ज़ाग़, ज़बान

ژ سے ژال، ژالہ، ژاژ

बड़ी ज़े (ژ) ज़ाल, ज़ाला, ज़ाज़

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

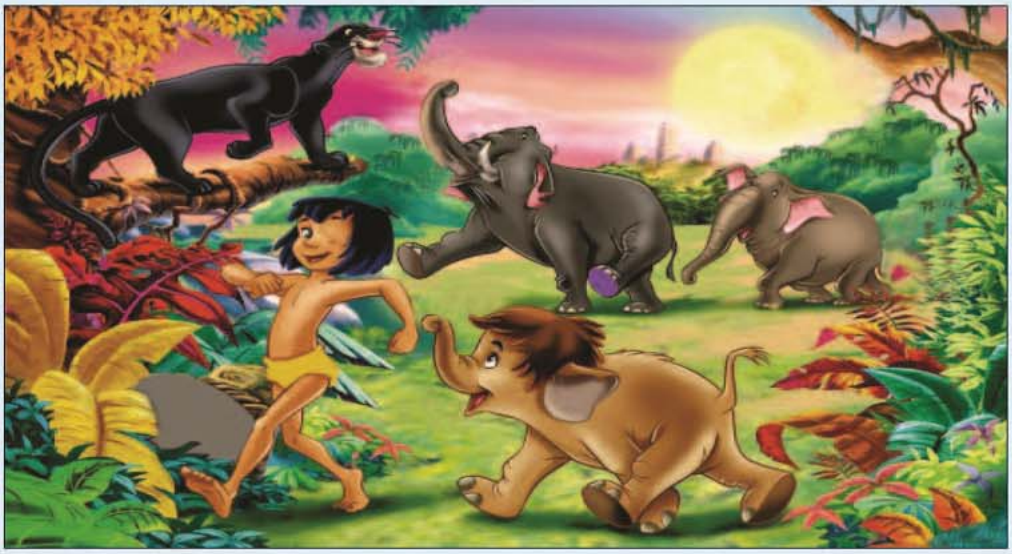

جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں ■

سحر اسعد

صبح کا بھولا

"ثمر! ایک گلاس ٹھنڈا پانی لاؤ۔" عاشر نے گھر میں داخل ہوتے ہی ثمر کو دیکھ کر حکم دیا۔

"اچھا بھائی، لائی۔" اور پھر وہ بوتل کے جن کی طرح ٹھنڈا پانی لے کر حاضر ہوگئی۔

"بری بات بیٹا! اس طرح تھک کر آکے فوراً پانی نہیں پیتے۔" امی نے ڈانٹا۔ "کچھ نہیں ہوتا امی۔" اس نے سنی ان سنی کردی۔ اور تبھی اس کی نظر ثمر سے بڑی بہن ثمن پر پڑی جو کمپیوٹر پر Corel DRAW کھولے کچھ بنانے کی کوشش کررہی تھی۔ "ارے یہ تم کیا کررہی ہو؟ یہ تم لڑکیوں کے بس کا کام نہیں ہے۔" وہ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کو ہٹا کر خود بڑے آرام سے کمپیوٹر پر بیٹھ گیا۔ اور پھر وہیں سے ہانک لگائی: "ثمن! ذرا میرے کپڑے پریس کردینا تو۔"

"جی" ثمن نے سر ہلایا۔

یوں تو عاشر پڑھنے میں بہت اچھا تھا اور ماں باپ کی عزت بھی کرتا تھا لیکن لڑکیوں اور خاص کر اپنی بہنوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکیاں کم عقل اور بے وقوف ہوا کرتی ہیں۔ ان کا کام گھر میں کھانا پکانے اور صفائی کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جبکہ لڑکے بڑی مشکل سے پڑھائیاں کرتے ہیں، گھر کا سودا سلف وغیرہ لاتے ہیں، کما کر اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہیں اور لڑکیاں کچھ نہیں کرتیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر اس مسئلہ پر اپنی بہنوں سے بحث کیا کرتا تھا۔ ثمر سے بڑی دو بہنیں ثمین اور ثمن تو اس کی باتوں کا جواب نہیں دیا کرتی تھیں لیکن ثمر اکثر اس سے لمبی لمبی بحثیں کیا کرتی تھی۔ اور وہ الٹا اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

اس دن وہ جب اسکول سے گھر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ امی اور اس کی بہنیں سامان پیک کررہی تھیں۔ "ارے۔ یہ کیا؟ آپ لوگ کہاں جارہی ہیں؟" اس نے سامانوں سے بھرے بیگ اور اٹیچی کیس کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! تمہیں بتانا بھول گئی تھی۔ تمہاری بڑی پھپھو

کے بیٹے کی شادی ہے۔ اور چونکہ ان تینوں کی بھی چھٹیاں ہیں۔'' انھوں نے تینوں بہنوں کی طرف اشارہ کرکے کہا'' اس لیے ہم ایک ہفتہ کے لیے کلکتہ جارہے ہیں۔'' انھوں نے اپنی بات پوری کی۔

''ہاں میری تو چھٹی بھی نہیں ہے۔ ورنہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلتا۔'' اس نے خوشی دباتے ہوئے کہا۔ درحقیقت وہ بہت خوش ہوگیا تھا کہ یہ سب چلی جائیں گی تو میں خوب موج کروں گا۔ ابو تو ویسے ہی پردیس میں تھے۔ وہ گنگناتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ تقریباً سوا گھنٹے آرام کرنے کے بعد اس کی نیند کھلی تو اس نے موندی موندی آنکھوں سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ 3 بج رہے تھے اور ان لوگوں کو ساڑھے تین بجے نکلنا تھا۔ وہ جلدی سے تیار ہوکر کمرے سے باہر آیا۔ ''لائیے امی! یہ سامان مجھے دے دیجیے۔'' امی نے اسے اٹیچی کیس پکڑا دیا۔ اسٹیشن پہنچ کر اس نے ٹرین کا پتہ کیا اور ٹکٹ خریدے اور پھر ان سب کو ٹرین میں بٹھا دیا۔ چونکہ ریل گاڑی چلنے میں ابھی دیر تھی اس لیے وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے ان کے ساتھ اندر جاکر ڈبے میں بیٹھ گیا۔

''دیکھو ثمر! تم مجھ سے ہمیشہ الجھتی رہتی ہو۔ بھلا بتاؤ لڑکیوں میں اتنی قابلیت ہوتی تو تم لوگ خود سے اسٹیشن نہیں آجاتیں۔ تم تو آرام سے آکر ٹرین میں بیٹھ گئیں۔ نہ ٹکٹ خریدنے کا جھنجھٹ، نہ ٹرین کا وقت معلوم کرنے کی فکر، سیدھے سیدھے ٹرین میں سوار ہوگئیں۔'' اس نے ثمر کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ جواباً ثمر نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہوگئی۔ اور پھر ریل گاڑی چلنے پر وہ واپس آگیا۔

گھر آکر اس نے اپنا ہوم ورک مکمل کیا، کچھ ضروری کام کیے اور پھر بڑے آرام سے سوگیا۔ اگلے دن کچھ دیر سے اس کی نیند کھلی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''اف ساڑھے چھ بج گئے۔'' روزانہ امی یا ثمین اسے اٹھایا کرتی تھیں۔ خود سے اٹھنے کی تو عاشر کو عادت ہی نہیں تھی۔ اور پھر اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور پھر کچن میں آیا۔ ''ارے یہ کیا؟'' آج تو کوئی کھانا بنانے والا تھا ہی نہیں۔ اس نے کچھ سوچ کر کچھ پیسے نکالے جو امی نے رخصت ہوتے وقت اسے تھمائے تھے اور اپنے گھر کے پاس واقع ہوٹل میں چلا گیا۔ اور پھر وہاں سے ناشتہ کرکے اسکول گیا۔ لیکن سارے دن اس کے پیٹ میں اینٹھن ہوتی رہی کیونکہ اس نے کبھی ہوٹل کا ناشتہ نہیں کیا تھا۔ روزانہ صبح امی اور اس کی بہنیں گرم گرم روٹی، آملیٹ، چائے تیار کرتی تھیں حالانکہ انھیں بھی اسکول جانا ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ اس میں سو سو نقص نکالتا تھا۔ لیکن آج اسے گھر کے کھانے کی قدر معلوم ہوئی۔ اور پھر جب چھٹی میں گھر آکر اس نے تالا کھولا تو اندر پہنچ کر وہ حیران سا ہوگیا۔ ململی چادر آدھی

بستر پر اور آدھی زمین پر لٹک رہی تھی، اوڑھنے والی چادر گول مول سی ایک کونے میں پڑی تھی۔ پورے گھر میں گرد پھیلی ہوئی تھی۔ باتھ روم میں گیا تو نالی کے گرد گندہ پانی جمع تھا۔ صبح نہانے کے بعد وہ وائپر کیے بغیر اسکول چلا گیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اسکول جاتے وقت کبھی اپنا بستر صحیح نہیں کیا تھا۔ وہ تو بس تیار ہو کر ناشتہ کر کے اسکول چلا جاتا تھا اور جب واپس آتا تھا تو پورا گھر آئینے کی طرح چمکتا ہوا ملتا تھا۔ اسے اپنے کمرے کی تمام چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی ملتیں، اس کے بستر کی چادر اور تکیے ایک جانب سلیقے سے رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ لیکن اس نے کبھی ان چیزوں پر غور نہیں کیا تھا کہ آخر جس کمرے کا حلیہ بگاڑ کر وہ گھر سے نکلتا ہے اس کے واپس آنے تک اسے کون جن سنوار دیتا ہے۔

پیاس لگنے پر اسے خود اٹھ کر فریج سے پانی نکال کر پینا پڑا۔ ایسے میں اسے ثمر بہت یاد آئی جو اس کے گھر میں داخل ہونے پر اس کی ایک آواز پر ٹھنڈا پانی لے آیا کرتی تھی۔ اس نے اپنا سر جھٹک کر ان سوچوں سے چھٹکارا پانا چاہا اور پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بڑی مشکل سے بستر درست کیا۔ اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔ صبح کا ناشتہ ہوٹل میں کر کے وہ پچھتا رہا تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، پھر کچھ سوچ کر کچن میں گیا اور فریج کھولا تو دیکھا کہ امی کچھ کباب بنا کر رکھ گئیں تھیں۔ اس کی جان میں جان آئی۔ اب روٹی کا مسئلہ تھا۔ وہ پھر دوکان پر گیا اور وہاں سے بریڈ خریدے تب اس نے کھانا کھایا اور پھر سونے کے لیے اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ لیکن تبھی اسے یاد آیا کہ اسے تو ابھی کپڑے پریس کرنے ہیں۔ بجھے دل سے اس نے کپڑے پریس کیے تب اسے سونے کا موقع ملا۔

اسے لگ رہا تھا کہ دن بڑی سستی سے گزر رہے ہیں۔ صرف چار دنوں میں گھر کسی کباڑ خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ چاروں طرف جالے لگ گئے تھے، کچن کا حال ابتر تھا، کھانا کھانے کا مسئلہ الگ تھا۔ تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ لڑکے اور لڑکیوں کی ذمہ داریوں کے خانے الگ الگ بانٹے گئے ہیں۔ بہنیں کتنی بڑی نعمت ہوتی ہیں۔ ان کے دم سے ہی تو گھر میں رونق رہتی ہے۔ گھر کا نظام کتنے حسن و خوبی سے چلاتی ہیں۔ اسے ان کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ اور پھر اس نے اپنی غلطی کی معافی مانگنے کا ارادہ کیا اور کاغذ قلم لے کر امی اور بہنوں کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ خط میں اس نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور ان سے جلدی واپس آنے کی التجا کی۔

دن کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ تبھی دروازے کی گھنٹی بجی۔ ثمر نے دروازہ کھولا تو سامنے ڈاکیہ کھڑا تھا۔ اس نے خط لے کر امی کو آواز دی۔ ''امی! امی! دیکھیے بھائی جان کا خط آیا ہے۔'' تینوں امی کے پاس جمع ہو گئیں۔ امی نے لفافہ چاک کیا اور پھر خط پڑھ کر مسکرانے لگیں۔ ''امی! آخر عاشر نے کیا لکھا ہے جو آپ اتنا خوش ہو گئیں۔'' ثمین نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''لو پڑھو تم لوگ بھی...'' امی نے خط ان کی طرف بڑھایا۔ خط پڑھ کر فرطِ مسرت سے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور امی کہہ رہی تھیں: ''صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔''

■

Sahar AsadD/O Asad Azmi
B-18/1G, Jamia Salafia Marg, Reori Talab
Varanasi - 221010 (UP)

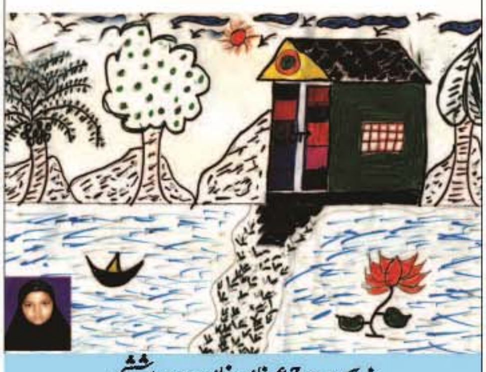

مدبحہ سروج عرفان خان، درجہ: ششم
الفران اردو مڈل اسکول، جل گاؤں، مہاراشٹر

انماز ہرا، درجہ: سوم، شعیب اردو اسکول، ممبرا، ضلع تھانے، مہاراشٹر

رامش مہدی، درجہ: دوم، شعیب اردو اسکول، ممبرا، ضلع تھانے، مہاراشٹر

صمیمہ صبا، محمد وسیم راجہ، درجہ پنجم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، مہاراشٹر

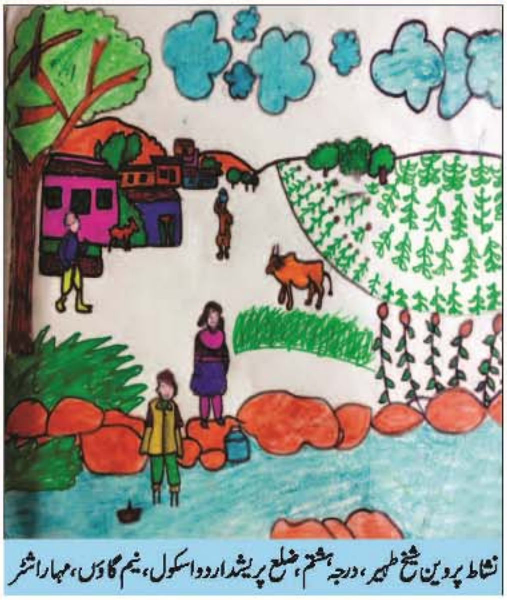

نشاط پروین شیخ طہیر، درجہ ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، مہاراشٹر

مہک پروین امین خان، درجہ ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، مہاراشٹر

طبرین شیخ حسن الدین، درجہ: ہفتم
فخرالدین علی احمد اردو ہائی اسکول، ورنگاؤں، بھساول، مہاراشٹر

سمیہ آفرین محمد ذاکر درجہ: یازدہم، غلام نبی آزاد اردو جونیئر کالج، باڑیگاؤں، مہاراشٹر

ارم انشا سید اکرام، درجہ: نہم، فاطمہ گرلس اردو ہائی اسکول بیگم پورہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

البینہ سحر شیخ شفیق، درجہ: ہفتم
فاطمہ گرلس اردو ہائی اسکول، بیگم پورہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

منصوری زکریا ڈاکٹر بدیع الزماں، درجہ: چہارم
اینگلو اردو پرائمری اسکول، نندوبار، مہاراشٹر

ثانیہ محبوب خان، درجہ: ہشتم، فاطمہ گرلس ہائی اسکول بیگم پورہ، اورنگ آباد

facebook اردو فیس بک

مجھے 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے۔ میں 'بچوں کی دنیا' لگاتار 3 سال سے پڑھ رہی ہوں۔ مجھے اس کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ معلومات، لطیفے، مجھے بہت پسند ہیں۔

شیخ عظمیٰ حنیف، درجہ: XI، اینگلو اردو جونیئر کالج، نندوبار

مجھے 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے۔ میں ہر مہینے 'بچوں کی دنیا' پڑھتا ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' کی کہانیاں اور نظمیں بہت پسند ہیں۔

منصوری زکریا ڈاکٹر بدیع الزماں، درجہ: چہارم، اینگلو اردو پرائمری اسکول

میں درجہ ہشتم میں پڑھتی ہوں۔ میں پنجم درجہ سے بچوں کی دنیا کا مطالعہ کرتی ہوں۔ مجھے اس کے مضامین اور ڈرائنگ اچھے لگتے ہیں۔

نمیرہ پروین شیخ جمیل، نگر پریشد اردو ہائی اسکول، گھاٹنجی

میں آٹھویں جماعت کا طالب ہوں۔ مجھے رسالہ 'بچوں کی دنیا' بہت پسند آیا۔ ہمارے صدر مدرس ہمیں اِسے پڑھنے کے لیے کہتے ہیں۔ اس میں کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں۔

سید شریف، نگر پریشد اردو ہائی اسکول، گھاٹنجی

میرا نام ام ہادیہ صدیقہ بنت عتیق الرحمٰن ہے۔ میں صغیر اوّل ثنا اینگلو، اردو پری پرائمری اسکول کی طالبہ ہوں۔ میں 'بچوں کی دنیا' کی کہانیاں، اپنی آپی اور بھیا جانی سے سنتی ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' کی نظمیں بہت پسند ہیں۔

ام ہادیہ صدیقہ، ثنا اینگلو اردو پرائمری اسکول، ناندیڑ، مہاراشٹر

مجھے 'بچوں کی دنیا' پڑھنا بہت پسند ہے۔ مجھے اس رسالے میں قسط وار ناول بہت پسند آتے ہیں۔ ننھے فنکار اچھا کالم ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں سبھی بچے یہ رسالہ پڑھتے ہیں۔ ہمیں یہ رسالہ ملنے میں بہت پریشانی ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم یہ رسالہ خریدتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔

سلمہ فردوس شیخ منشی، درجہ: نہم، مولانا آزاد اسکول اڑگاؤں، آکولہ، مہاراشٹر

میرا نام بشریٰ انجم انصار خان ہے۔ میں درجہ نہم مولانا ابوالکلام آزاد ہائی اسکول اڑگاؤں کی طالبہ ہوں۔ میں 'بچوں کی دنیا' بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ مجھے اس رسالہ میں قصہ حاتم طائی، کہانیاں، نظمیں بہت پسند آئیں۔ 'بچوں کی دنیا' سے یوں ملاقات ہوئی کہ میں اپنی سہیلی سلمیٰ کے گھر گئی تھی اس کے گھر پر مجھے یہ رسالہ ملا۔ تب سے میں ہر ماہ اس کو توجہ سے پڑھتی ہوں۔

بشریٰ انجم انصار خان، درجہ: نہم، تعلقہ تلہارا، ضلع آکولہ، مہاراشٹر

مجھے اردو پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ 'بچوں کی دنیا' بہت اچھا رسالہ ہے۔ میرے چاچا شہزاد سر مجھے یہ رسالہ ہر ماہ رشید بک ڈپو سے لاکر دیتے ہیں۔ میں اس کی ساری کہانیاں پڑھتی ہوں۔ مجھے ہر ماہ اس کا بڑی بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔

عائشہ بانو بنت کمال احمد، گورنمنٹ اردو اسکول، برہانپور، مدھیہ پردیش

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

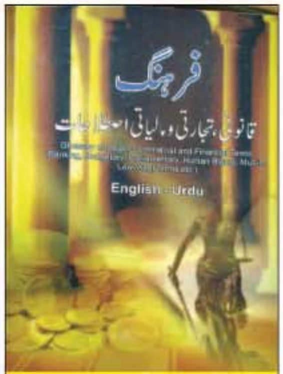

صفحات:713، قیمت:290 روپے

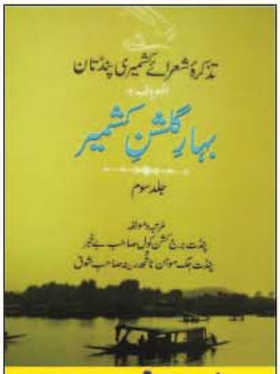

صفحات:602، قیمت:350 روپے

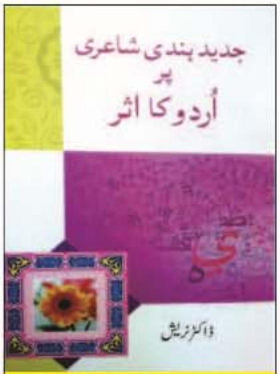

صفحات:155، قیمت: 90 روپے

صفحات: 136، قیمت: 80 روپے

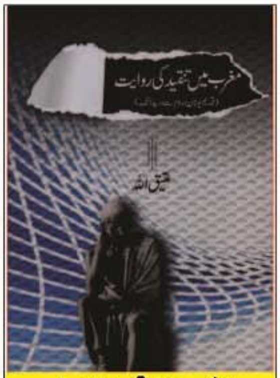

صفحات: 568، قیمت:245 روپے

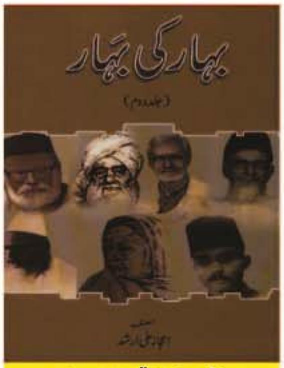

صفحات:242، قیمت:150 روپے

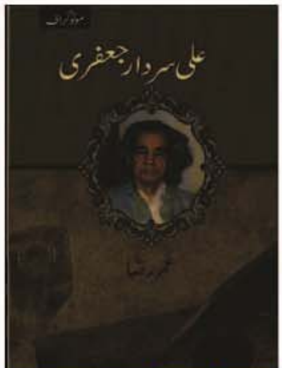

صفحات:165، قیمت: 90 روپے

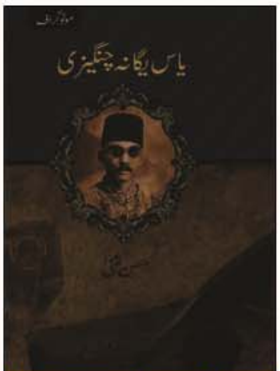

صفحات: 149، قیمت:90 روپے

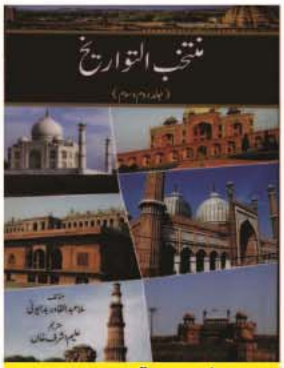

صفحات:215، قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746 فیکس:011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, January 2018, Vol. 06, Issue: 01
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/12/17
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

صفحات:112، قیمت:25 روپے

صفحات:108، قیمت:35 روپے

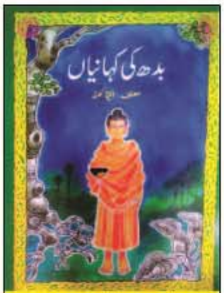

صفحات: 80، قیمت: 65 روپے

صفحات:80، قیمت:35 روپے

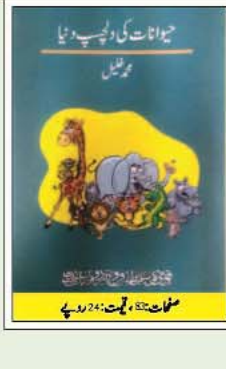

صفحات:83، قیمت:24 روپے

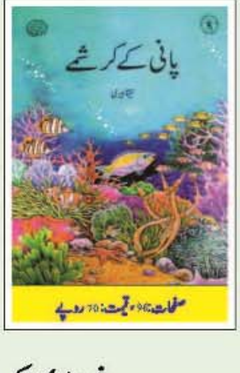

صفحات:96، قیمت:70 روپے

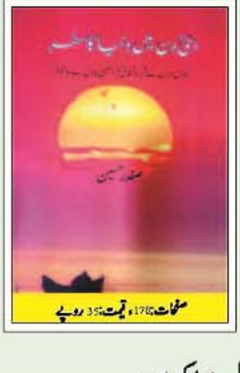
صفحات:170، قیمت:35 روپے

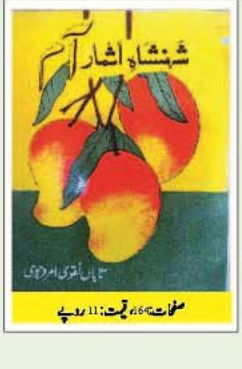

صفحات:16، قیمت:11 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.